

کولتار
COAL TAR
مصنفہ
مرزا عظیم بیگ چغتائی
SAM/ 32

جملہ حقوق محفوظ

کولتار

مُصنّفہ

جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی اے، ایل ایل، بی، (علیگ)
وکیل چیف کورٹ مارواڑ

بسعی واہتمام

مولوی شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی

مُدیر مجلہ "ساقی" دہلی

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

فہرستِ مضامین

پیشکش

لابیلاڈیم سائنس مرسی آف علیگڈہ

محترمہ میں اپنی اس ناچیز تصنیف کو آپ ہی کی خدمت میں

کیوں نہ پیش کردوں !

گر قبول افتد زہے عز و شرف

آپ کا

ن ۔ ا ۔ آر ۔ ش

عظیم بیگ چغتائی

جودھپور ۔ یکم جنوری سنہ ۳۲ء

ہر افسانہ پر آپ کو واقعہ کا دھوکا ہوگا، اور ہر واقعہ پر ایک افسانہ کا!!

دیباچہ

میں اپنی اس ناچیز تصنیف کو ناظرین کی خدمت میں کسی جھجک کے ساتھ نہیں پیش کرتا۔ بلکہ ایک فخر اور اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ اگر یہ فخر اور بلندیٔ خیال کسی طرح بھی خودستائی کی تعریف میں آتی ہے اور آسکتی ہے تو اس کے ذمہ دار نہ صرف میرے خاص قدردان اور دوست احباب ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری اُس شخص پر عاید ہوتی ہے۔ جو اردو پڑھنا لکھنا جانتا ہے۔ اس کے خاص خاص ابواب ہدیۂ ناظرین ہو کر بیحد مقبول ہو چکے ہیں۔ محض ایک باب "آلو کا بھرتہ"[1] لیجئے۔ بلا مبالغہ جسوقت سے وہ نیرنگ خیال میں شائع ہوا ہے رجسکو سال بھر کا عرصہ ہونے آتا ہے) لگاتار مختلف رسالوں اور اخباروں میں تادمِ تحریر شائع ہو رہا ہے۔ میری تعلّی معاف ہو۔ کیا ابتک کسی مصنف کے کسی افسانے نے یہ مقبولیت حاصل کی ہے؟ کیا اردو کی تاریخ میں کوئی دوسرا افسانہ اس سے زیادہ مقبولِ عام ہوا ہے؟ پھر اگر میرا دماغ خراب ہو جائے اور میں سوچنے لگوں کہ "ہمچو من دیگرے نیست" تو حضرت اسمیں خطا ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے مجھے سر پر چڑھایا نہ کہ میری۔ میری تعلّی، میری شیخی، میری خود پسندی اور کبر و نخوت کے میرے

---

[1] اس سلسلہ میں یہ سنانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس تحریر کے مطابق ایک خاتون نے آلو کا بھرتہ پکایا اور مجھے اطلاع کرائی کہ کچھ ایسا عمدہ نہیں رہا۔

قدرداں ذمہ دار ہیں نہ کہ میں۔

اس مختصر تشریح کے بعد میں کتاب کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں سب سے اول گذارش یہ ہے کہ تمام افسانے معاشرتی اور اخلاقی ہیں اور اپنے زاویۂ نگاہ سے ہر افسانہ میں میری کوشش یہی ہے کہ کسی خاص مقصد۔ کسی خاص کُلیہ کی اشاعت ہو وہ مقصد یا کلیہ کیا ہے؟ شاید میں خود بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہر افسانہ کا مقصد کسی خاص بات کی اشاعت ہے اور نصیحت کو میں نے اسقدر پیچ در پیچ پھولوں میں لپیٹنے کی کوشش کی ہے کہ شاید آپ کو جب پتہ چلے گا جب آپ اسکو قبول کر چکے ہونگے۔ واللہ اعلم اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تمام افسانے اسمیں اوریجنل ہیں میں نے کسی انگریزی یا یورپین افسانے سے نہ تو کسی کا پلاٹ لیا ہے اور نہ خیالات میں کسی کی تتبع کی ہے۔

سب سے زیادہ ضروری بات جو ہے، وہ یہ کہ میں نے اس کتاب میں کسی معاشرت کا فوٹو نہیں کھینچا ہے اور نہ ملک کی مایہ ناز ادبی معاشرتی ناول لکھنے والی محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کی طرح کوئی اپنا ماڈل پیش کیا ہے بلکہ اُس معاشرت کی یہ ایک جھلک ہے جسمیں قدیم اور جدید تہذیب دونوں کی چاشنی موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے جو لوگ اِس ماحول سے دور ہیں اور در اصل باوجود ریل کی تیز رفتاری کے ان سے اب بھی دلّی اتنی ہی دور ہے جتنی پہلے اور ان کے گرد و پیش جو معاشرت ہے اس کے دیکھتے ہوئے اِس محدود معاشرت کا وجود انکو خیالی معلوم ہوتا ہے تو وہ حق بجانب ہیں کہ ان افسانوں کو خواہ کسی فرضی معاشرت کا ماڈل تصور کریں یا کچھ اور۔

لیکن جو خود اِس ناؤ میں بیٹھے ہیں وہ ان افسانوں کو پڑھ کر چونک سے پڑتے ہیں اور اِس سلسلہ میں میری کتاب "روحِ ظرافت" پر جو ریویو علیگڈھ میگزین میں شایع ہوا ہے اس کا ذیل کا اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

.. ۔ اکثر افسانے علیگڈھ کی مجموعی زندگی کا تجربہ معلوم ہوتے ہیں۔ گویا کہ مختلف صورتوں میں مناسبت وقت کے لحاظ سے کچھ گھٹا بڑھا کر یہاں کی (یعنی علیگڈھ کی) زندگی کو بکمال لطفِ بیان تشکیل دیدیا ہے۔ اکثر مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں گرد و پیش کا کوئی واقعہ بیان کر رہے ہیں لیکن کھل کر نہیں کہتے اور "عاقلاں را اشارہ کافی ست" کے پردہ میں خوب خوب گل کھیلتے ہیں۔

..... "گوتار" میں سعدی کے اس نظریہ کو کہ۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں لذت از گفتار خیزد

بہت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے..... " (علیگڈھ میگزین تعطیلات نمبر صفحہ نمبر ۱۹)

چنانچہ اسی وجہ سے میں ضروری اور اشد ضروری خیال کرتا ہوں کہ عرض کروں بلکہ اعلان کر دوں کہ اس کتاب کے تمام افسانے معہ اپنے کیرکٹروں کے بالکل فرضی، بالکل منگھڑت اور محض خیالی ہیں۔ نہ کسی افسانہ کے اصلی ہیرو کا وجود ہے اور نہ کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی افسانہ کے اکھڑے اکھڑے واقعات لیکر اسمیں سے کچھ گھٹا بڑھا کر اُدھر اُدھر کہاں جھپاڑ کر اور اپنے حالات کے مطابق بنا کر مصنف کی جان کو اٹک جائے اور اسپر الزام یہ دے کہ حضرت ایسا نہیں بلکہ ایسا ہوا تھا۔ یہ آپ نے میرے ساتھ کیسے ظلم کیا اور اپنی طرف سے جوڑ کر یہ ایسا کیوں لکھدیا۔ مگر میرا عذر کہ یہ افسانے ہیں اور بالکل خیالی ہیں میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ ہرگز نہیں سنیں گے اور ضرور خیال آرائی کو دخل دیں گے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کہ اس کتاب کے سرٹل باب پر ہمارے بھائی اور نادیدہ دوست حضرت ایم۔ اسلم نے اپنی نادر الوجود مزاحیہ کتاب "مزاحی" میں خود میرے اوپر ہاتھ صاف کر دیا! اور واللہ کیا تہ کو پہونچے ہیں! واقعہ یہ ہوا کہ رسالہ ساقی کے ظریف نمبر [illegible] میں حضرت ایم۔ اسلم کا مضمون "معشوقی رقعہ" چھپا تھا جو انکی کتاب "مزاحی" کا ایک باب ہے اور اسی نمبر میں اس کتاب کا سرٹل افسانہ "گوتار" بھی چھپا تھا۔ حضرت ایم۔ اسلم۔ کا

"دعوتی رقعہ" مجھے ظریف نمبر کی جان معلوم ہوا اور میں نے اڈیٹر صاحب رسالہ ساقی کو اسکے بارہ میں خط لکھا کہ یہی رسالہ کا بہترین مضمون رہا اور اُدھر بدقسمتی سے حضرت ایم اسلم۔ اسی قسم کا خط "کولتار" کے بارہ میں لکھ چکے تھے چنانچہ اس عجیب اتفاق پر حضرت ایم اسلم اپنی کتاب "مزاجی" کے باب "اڈیٹر اور شعراہم" میں حسب ذیل لطیفہ درج کرتے ہیں۔

"... ہماری منصفانہ رائے کی رُو سے بھی رسالہ ساقی "ظریف نمبر" میں بہترین چیز جناب مرزا صاحب کا "کولتار" تھا یا تھی۔ اور جناب یہ واقعہ ہے کہ ہم نے "کولتار" صاحب تین بار پڑھا یا پڑھ کر سنایا جتنی کہ خداوند کریم نے ہم پر اور خاص کر آپ لوگوں پر نمازیں فرض کر رکھی ہیں۔ ہمارے خیال میں جناب مرزا عظیم بیگ صاحب دام وکالتہ نے یہ بے حد دلچسپ افسانہ کچھ اس انداز سے بیان فرمایا تھا کہ ؎

دیکھا جو "کولتار" تو مجھکو ہوا گماں ! حضرت کی اپنی ہی نہ کہیں سرگذشت ہو

اب بتائیے اس کا کیا علاج! لہٰذا اس معذرت کے بعد اب عام اجازت میری طرف سے ہے کہ جسکا جی چاہے ان واقعات کو اپنے حالات زار یا اپنے واقعات سے چسپاں کر کے علیگڈھ کو سر پر صرف اُٹھا ہی نہ لے بلکہ اٹھا کر میرے سر پر دے مارے۔ مگر یہ واضح رہے کہ اگر کسی نے ایسا کیا تو تمام ایسے خطوط آئندہ اڈیشن میں بطور تتمہ دیدیئے جائیں گے۔

ایک عرض اس کتاب کے بارہ میں اور ہے۔ وہ یہ کہ یہ کتاب سب کے لئے لکھی گئی ہے مگر ہاں اُن حضرات کے لئے نہیں جن کی ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ بس نہیں کہ واقعی اپنی گھر والیوں کو "آلو کے بھرتہ" کی مثال پیش کر کے اس سے بھی زیادہ ذلیل کریں۔ میری دانست میں "آلو کا بھرتہ" طبقۂ اُناث کی اُس ذلت کو ظاہر کرتا ہے جسکو ہمارے نام نہاد معاشرتی باورچی دسترخوانِ معاشرت کی زیب و زینت سمجھتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ محسوس کریں کہ مسلمان عورتیں کیسی ذلت کا شکار ہو رہی ہیں اور کوشش کریں کہ ایسے مرد نہ ہو جائیں وہ تلقین کرتے ہیں کہ سب بیویوں کو ایسا ہی (ذلیل) ہو جانا چاہئے۔ انکی دانست میں عورت کو ایسا ہی ہونا چاہئے، انکی دانست میں عورت کا عین فرض ہی یہی ہے۔ انکی دانست میں مرد کا حق ہے کہ وہ اگر زیر ہو تو محض اسی حربہ سے۔ اللہ رے فرعونیت! اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے پڑھنے والے ایسے ہیں جو شکایت کریں کہ واقعی

میں نے آلو کا بھرتہ میں عورت ذات کی انتہائی ذلت کی ہے مگر حسرت یہ واضح رہے کہ یہ آلو کا بھرتہ اسی زمانے میں اور جمعیۃ العلماء ہند کے راج میں پک سکتا ہے۔ ورنہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اگر سرزمین حجاز میں اس کا امکان ہوتا تو اسلام کب کا فنا ہو چکا ہوتا۔

آخر میں میری درخواست ہے کہ کتاب میں اگر کوئی لغزش ہو۔ زبان کی غلطی یا اور کوئی ادبی سہو ہو تو چشم پوشی سے کام لیں۔ اگر کہیں مضمون بے ربط ہو یا پلاٹ کی کمزوری عیاں ہو تو مطلع کریں تاکہ آیندہ اڈیشن میں کتاب کی اور بھی جلا ہو جائے۔

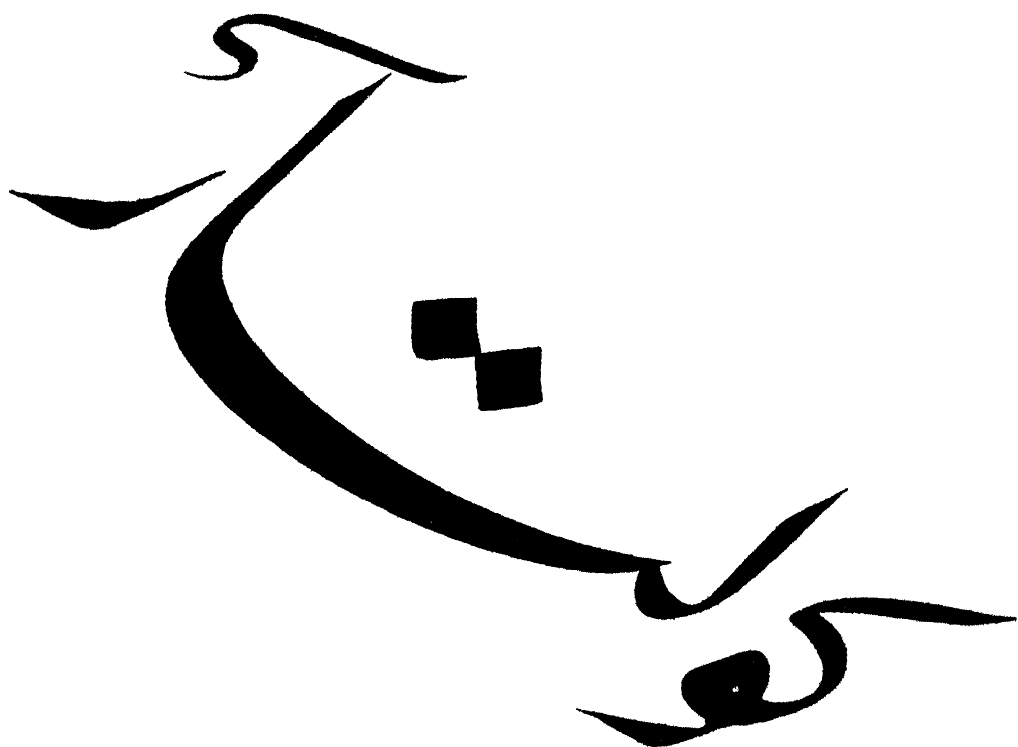
اس کتاب کی ترتیب میں جو کچھ بھی ناقابل معافی دیر ہوئی اس کا میں ذمہ دار ہوں۔ مگر یقین دلاتا ہوں کہ اس میں بہتری ہوئی۔ ورنہ اس حسنِ ترتیب کے ساتھ جو پیش نظر ہے اس کا پیش کیا جانا امر محال تھا۔

اس سلسلہ میں میرے دلی شکریہ کے مستحق برادرم مسٹر شاہد احمد بی۔ اے۔ (آنرز) اڈیٹر رسالہ ساقی ہیں جنکی انتھک کوششوں سے اور جنکی مسلسل جدوجہد سے اس کتاب کی ترتیب ممکن ہوئی نہ صرف انہوں نے مجھے ترتیب میں امداد دی ہے بلکہ اصل رہبری انہوں نے کی ہے اور یہ کتاب محض انہی کی فرمایش پر ترتیب دی گئی ہے اور یہ انہی کی ہمت تھی کہ خود مجھ سے زیادہ انہوں نے اس کے مکمل کرنے میں محنت کی۔ اگر یہ کتاب اچھی کہی جا سکتی ہے اور مصنف کی تعریف کی جا سکتی ہے تو بجا آدھی سے زیادہ تعریف کے مستحق خود برادرم شاہد صاحب ہیں۔

اس کتاب کے ساتھ ساتھ میری دوسری کتاب "روح لطافت" بھی شائع ہوتی ہے یہ دونوں کتابیں تو پریس سے نکلتی ہیں اور تیں اور کتابیں ساتھ ہی پریس میں جاتی ہیں۔ دیکھیں آپ پڑھتے پڑھتے تھکتے ہیں یا ہم لکھتے لکھتے۔ فقط

عظیم بیگ چغتائی
وکیل چیف کورٹ مارواڑ

جودھپور
مورخہ یکم فروری سنہ ۳۲ء



باب (۱)

ٹکٹ چیکر

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کالج میں چار روز کی چھٹی ہوئی۔ اور لوگ تو دہلی سیر کرنے اُسی روز چلدیئے مگر ہماری تقدیر کی خوبی سے ہمیں منی آرڈر وصول کرنے کی وجہ سے ایک دن کی دیر کرنی پڑی۔ ہم نے اپنے ساتھیوں کو رخصت کرتے وقت کہا کہ چلو ہم بھی کل تک پہونچ جائیں گے۔ بغیر ہمارے دوستوں کو کوفت تو ہوئی مگر مجبوری۔

دوسرے روز اسٹیشن پر پہونچے تو ایک اور دوست ملے۔ یہ حضرت بے ٹکٹ سفر کرنے کے ہمیشہ سے عادی تھے رُہتک کے رہنے والے تھے اور پندرہ روز کی چھٹی لیکر ایک ضروری کام سے غالباً اپنی بیوی کی شادی میں، گھر جارہے تھے۔ ہمارا کیا نقصان تھا اگر ہمارے ساتھ یہ بے ٹکٹ سفر کریں ہم سے اُنھوں نے وعدہ لے لیا کہ ہم انہیں اپنا ٹکٹ غازی آباد کے اسٹیشن پر دیدیں گے تاکہ یہ باہر جاکر وہاں سے رُہتک کا ٹکٹ لے لیں۔

(۱)

غازی آباد کے اسٹیشن پر ہم نے اپنا ٹکٹ اپنے دوست کو دیا اور وہ اُسکو لیکر باہر ٹکٹ خریدنے گئے ہم اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے سگرٹ کے دھوئیں کے چھلّے بنا رہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب بہادر نے ہماری ناک کی طرف ٹکٹ چیک کرنے کی قینچی پیش کی۔ وہ باہر پلیٹ فارم پر تھے اور ہم

اندازاُن کی صورت ہی سوال تھی یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ٹکٹ چاہیئے۔ ہم نے قصداً کوئی توجہ نہ کی کیونکہ ہمارا ٹکٹ ہمارے دوست کے پاس تھا۔ تھے درصل یہ صاحب انگریز مگر روپیہ میں صرف دو ڈھائی آنہ بھر۔

ہم نے تو ٹکٹ دیا نہیں مگر اور لوگ اُن کی خدمت میں ٹکٹ پیش کرنے لگے۔ جب سب کے ٹکٹ یہ دیکھ چکے تو پھر ہماری صورت پہ نازل ہوئے، مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ ہم ان کی طرف دیکھتے ہی نہیں تو کچھ بُرا مانکر انہوں نے کہا "ٹکٹ"۔

ایک معمولی قواعد داں یا زبان دان جانتا ہے کہ ازروئے قواعد زبان دُنیا کی کسی ایک شے کا نام لینے سے مکمل جملہ نہیں بن سکتا۔ ہم ٹھہرے طالعلم چنانچہ ضروری معلوم ہوا کہ انکو کچھ قواعد کا بھی سبق دیں۔ اوپر سے نیچے تک انکو ہم نے غور سے دیکھا اور یہ سوچکر کہ یہ حضرت نامکمل جملہ بولتے ہیں ہمنے بھی ذرا کرخت لہجہ میں ان سے کہا "سوڈا واٹر"۔

وہ بولے "ریلوے ملازمین سے مذاق کرتے ہو" کچھ بگڑ کر۔

ہمنے کچھ ترش روئی سے کہا "مسافروں کو تکلیف دیتے ہو!"

"ہماری ڈیوٹی ہے۔ ہماری یہ ڈیوٹی ہے کہ ہم ٹکٹ چیک کریں" کچھ زور دیکر۔

"ہماری بھی یہ ڈیوٹی ہے کہ ہم انہیں اپنا ٹکٹ دکھائیں"۔ کچھ برافروختہ ہو کر۔

"تو پھر آخر ٹکٹ کیوں نہیں دکھاتے" وہ بولے۔

ہمنے دافعہ کہا کہ "مگر تم نے ہم سے اسکے ٹکٹ نہیں مانگا"۔

"میں نے مانگا"۔

"غلط کہتے ہو۔ تم نے ہرگز ہم سے ٹکٹ نہیں مانگا۔ تمنے صرف "ٹکٹ" کہا اور اس نامکمل جملہ سے ہم نہیں سمجھے کہ تم کیا کہتے ہو کیونکہ ازروئے قواعد یہ نامکمل جملہ ہے ہمکو کہنا تھا کہ ٹکٹ دکھاؤ تاکہ ہم

چیک کریں۔"

کچھ مسکرا کر وہ بولے "معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ لفظ ٹکٹ کہنے سے مطلب ہی یہ ہے کہ ٹکٹ دکھاؤ۔"

ہم نے کہا "کیا ریلوے میں کوئی قاعدہ ایسا بھی ہے جس کی رُو سے ایسے لوگ سفر نہیں کر سکتے جنکے پاس معمولی عقل بھی نہ ہو۔"

بہت خوش ہو کر اور اس مذاق کو پسند کر کے ہنستے ہوئے بولے "اچھا میں عقل چیک نہیں کرتا ٹکٹ دکھاؤ۔" اور مسافر بھی ہنسنے لگے۔

"ٹکٹ ہم تھوڑی دیر بعد دکھائیں گے۔"

"کیوں"؟

"بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ایک دوست بے ٹکٹ سفر کر رہے ہیں اور ہمارا ٹکٹ لیکر وہ اپنا ٹکٹ یہاں سے خریدنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے ذرا دیر بعد آئیگا۔"

مسافر اس پر ہنسنے لگے اور ٹکٹ چیکر صاحب نے کہا "میں مذاق نہیں کرتا۔"

ہم نے کہا "میرا بھی یہی حال ہے۔" لوگوں نے قہقہہ لگایا۔

"میں تمہیں پولیس میں دے سکتا ہوں۔"

یہ ہم سُن کر بگڑ کھڑے ہوئے اور محض جھگڑا مول لینے کی نیت سے گاڑی میں سے اُتر کر اُن کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور اُن سے کہا "ہم تمہاری رپورٹ کریں گے۔"

عجب نہیں کہ بات بڑھ جاتی کہ اتنے میں ہمارے دوست ٹکٹ لیکر آگئے ہمنے ان سے اپنا ٹکٹ لیکر دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے ہم مذاق نہیں کرتے یہ ابھی ٹکٹ لیکر آرہے ہیں۔"

ناظرین کو شاید تعجب ہو کہ ہمنے اپنے دوست کو اس طرح کیوں پکڑوا دیا تو بات دراصل

یہ ہے کہ ہمارے اس فعل سے دوستی میں کوئی فرق ہی نہیں آتا۔ اُنکو ہم سے اس کی پیشتر سے توقع تھی اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی دلچسپی پیدا ہو سکنے کی امید ہو تو ایسا ضرور کرنا چاہیئے۔ یہ کوئی بُرا ماننے کی بات ہی نہیں۔

ہمارا ٹکٹ چیک کرنے کے بعد وہ ہمارے دوست کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن سے پوچھا" آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

نہایت ہی سنجیدگی سے انہوں نے سچ سچ کہدیا "گھر"

"گھر" ؟

"گھر"

"یعنی . . ؟"

بات کا ٹکڑ "یعنی گھر" زور سے قہقہہ لگا۔ ٹکٹ چیکر صاحب بگڑ گئے اور بولے "کونسا اسٹیشن ہے آخر گھر تو سب ہی جا رہے ہیں۔ آپ اسٹیشن بتایئے۔"

"میں نہیں بتاتا" وہ تنکر بولے "لیکن آپ ٹکٹ دیکھ سکتے ہیں" یہ کہکر انہوں نے ٹکٹ پیش کیا۔ چیکر صاحب نے ٹکٹ دیکھا جس پر دروازہ کی چیکنگ کا نشان تھا۔ ٹکٹ غازی آباد سے رُہتک کا تھا انہوں نے اُلٹ پلٹ کر کہا "آپ آ کہاں سے رہے ہیں؟"

"جہنم سے" انہوں نے جلکر کہا "مجھے . . . . فضول وقت ضائع نہ کیجئے"

ٹکٹ چیکر صاحب بولے "آپ علیگڈھ سے آرہے ہیں اور میں آپ سے چارج کرونگا"

"میں کہہ چکا کہ میں . . ." یہ کہکر انہوں نے ٹکٹ چیکر کے ہاتھ سے ٹکٹ اچک لیا اور کُود کر ڈبہ میں آ گئے وہ بھی لپکے مگر یہ حضرت لوٹا لیکر پاخانہ میں۔ ریل چلدی۔

اب اس دوران میں ایک صاحب سے ہمنے اپنا ٹکٹ بدل لیا۔ یہ ٹکٹ کا پورسی دہلی کا تھا۔

ٹکٹ چیکر صاحب کہکر بیٹھ گئے کہ دہلی پران کو مزا چکھاؤنگا۔ پاخانہ سے ہمارے دوست جو نکلے تو پھر وہی باتیں، ٹکٹ دکھانے سے اِدھر سے انکار اور اُدھر سے اصرار۔ تصفیہ اس امر پر ہوا کہ دہلی کے اسٹیشن پر دیکھ لیں گے۔

اب ہمنے بڑی صفائی سے ایسے کہ ٹکٹ چیکر دیکھ نہ لے اپنے دوست کا ٹکٹ لیکر اس کے عوض میں دوسرا ٹکٹ اُنکو چپکے سے دیدیا اور رہتک کا ٹکٹ لیکر اب ایک اور صاحب کو جو ہم سے بہت زیادہ عقلمند تھے انکا ٹکٹ لیا جو ٹونڈلے سے دہلی تک کا تھا۔ اب اطمینان سے دونوں دہلی کے منتظر۔

دہلی کے اسٹیشن پر قبل اس کے کہ ٹکٹ چیکر صاحب ہم سے کہیں اُلٹا ہم نے اُن کا ہاتھ پکڑا کہ آپ کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس چلنا ہوگا قصہ مختصر اسٹیشن ماسٹر تو ملا نہیں ڈپٹی اسٹیشن ماسٹر کی قسم سے کوئی انگریز ملا ہم دونوں پہونچتے ہی گو یا برس پڑے اور اُس سے کہا کہ "ٹکٹ چیکر صاحب شاید شراب کے نشہ میں ہیں اور ہمیں تنگ کر رہا ہے"۔ بیان کرنے کا موقعہ ٹکٹ چیکر صاحب کو دیا گیا اور انہوں نے واقعہ بیان کیا۔ ہم نے سنکر کہا "ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"، تمام واقعات سے یکسر لاعلمی ظاہر کر کے ہمنے کہا کہ "یہ بالکل غلط کہتے ہیں ہم دونوں آپس میں دوست کجا ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں اور پھر علاوہ اسکے چیکر صاحب تو ہمیں یہاں اس بات پر لائے کہ ہم اون سے لڑتے ہیں اور اب یہ قصہ!" اور پھر اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا "کیا آپ اب بھی نشے میں ہیں؟"

ہم دونوں نے اپنے اپنے ٹکٹ دکھائے بہت کافی دلیلیں اور حجت ہوئی۔ گواہ ڈھونڈھنے اُس ڈبہ میں ٹکٹ چیکر صاحب گئے تو ایک بھی نہ ملا غرض ہم دونوں وہاں سے بری ہوئے کیونکہ خوش قسمتی سے یہ حضرت شاید کبھی شراب پی کر مسافروں سے اُلجھ چکے تھے کیونکہ ڈپٹی اسٹیشن ماسٹر نے

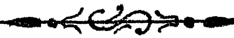
ہوئیں شکیٹر کراُن سے کہا "اس قسم کے قصے میں نہیں پسند کرتا" اور ہم دونوں سے کہا آپ جائیے"
یہ گویا ان ٹکٹ چیکر صاحب سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔

(۲)

ہمارے پاس والد صاحب قبلہ کا خط امتحان کے بعد ہی آیا تھا کہ تم "وہاں" ہوتے ہوئے گھر پر آنا۔ گو ہم خود گھر پر تھے اور والد صاحب ملازمت پر مگر در اصل گھر وہ تھا کہ اصلی وطن جہاں ہم پڑھ رہے تھے، امتحان کے پرچے تمام چوپٹ ہو گئے اور نتیجہ شائع ہونے والا ہی تھا۔ اگر ہم "وہاں" پہونچتے تو ساتھ ساتھ امید تھی کہ "وہیں" ہمارے فیل ہونے کی خبر بھی ہمارے ساتھ ساتھ پہونچے گی۔ لہذا "وہاں" کا جانا "مشروط بہ کامیابی در امتحان" قرار پایا۔

پاس ہونے کی خوشی کا اندازہ لگانا در اصل مشکل ہے خصوصاً جبکہ تمام اُمیدیں منقطع ہو گئی ہوں اور پھر تھرڈ ڈویژن مار دی جائے۔ ہمارے ایک دوست کا یہ حال ہوا کہ بیان سے باہر۔ در اصل ہم اپنے بارہ میں تو کہہ سکتے ہیں کہ شادیِ مرگ کے نظریہ کے قائل ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دو تین سکنڈ تک تو یہ گمان رہا کہ مر رہے ہیں۔ مارے خوشی کے اوس روز کوئی قتل ہمیں نہیں کیا یہی غنیمت ہے۔ تار دینے کے لئے ڈاکخانہ گئے تو بابو کو مارتے مارتے چھوڑا اور پھر اس روپیہ کو نہایت ہی بیدردی سے خرچ کرنے بار بار دوڑے جس کا پائی پائی کا حساب نہیں دینا تھا مگر اب بھلا کسی کی کیا مجال تھی کہ اس روپیہ میں سے کوڑی ہی لیلے کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ پاس ہونے کے جھلیے میں اسکا خورد بُرد کر دینا آسان تھا جوب جاتے تھے کہ پاس ہونے پر دو چار دن تک کیا بلکہ ہفتوں جھگیاں پاس نہیں آتیں اور پھر حساب فہمی کے معاملات معرضِ التوا میں پڑ جاتے ہیں اس طرح روپیہ جیب میں اور ہم "وہاں" ہوتے ہوئے گھر جا رہے تھے۔ لیکن دو چار مودی اور بل

گئے اور انھوں نے کہا کہ اب "وہاں" ہوتے ہوئے گھر جانے کے بجائے بہتر ہے کہ پہلے لکھنؤ اور پھر "وہاں" اور پھر والد صاحب کے پاس جاؤ ہم راضی ہوگئے کئی ایک ٹائیاں اور نئی ٹوپی کے علاوہ کئی جوڑی موزے لئے یہ وہ لوازمات تھے جو ہم نے فوراً خریدے اور پھر یہ سوچکر کہ لوگ سمجھیں کہ یہ گھر پر ہمیشہ سلیم شاہی جوتہ پہنتا ہے اسلیپر بورڈنگ کے بیرے کے سر پر مارا اور نیا خریدا اب گویا ہم امیدوار بنکر "بردکھاوے" کے لئے اپنی مجوزہ سسرال جانے کیلئے تیار تھے



بڑی اچھی ساعت سے ہم دوستوں کے ساتھ روانہ ہوئے تھے کیونکہ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر ہمارے دو اور ساتھی مل گئے جو لکھنؤ سے بھی آگے جارہے تھے۔ ٹونڈلہ پر ایک طالب علم مناحسرت ہماری گاڑی میں آئے۔ بے تکلفی مگر فراخ دلی سے اُنھوں نے سگرٹ خرچ کرنیکے بعد مسکرا کر کہا۔ "ذرا ٹکٹ چیکر کو دیکھتے رہیئے گا میں بے ٹکٹ ہوں"۔ ہم نے نوٹ کرلیا اور حسب الارشاد دیکھتے رہے۔

خوش قسمتی یہ خوش قسمتی کے ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اطمینان سے باتیں بھی نہ کرنے پائے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ پلیٹ فارم کے اُس پار وہی ٹکٹ چیکر صاحب کھڑے ہیں جن سے چار پانچ ماہ پیشتر بھی غازی آباد کے اسٹیشن پر قصہ رہا تھا۔ فوراً ایک قلی سے کہا کہ جاکر صاحب سے کہو کہ تمہارے ایک بڑے پرانے دوست بلاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آکھڑے ہوئے اور ہمیں نہ پہچان کر قلی سے بولے "کون بلاتا ہے؟"

ہم "ہمنے آپ کو بلایا ہے"

وہ "کیوں کس واسطے؟"

ہم "اسلئے کہ آپ سے روپیہ کی ریزگاری لینا ہے۔ اگر ہو تو عنایت کیجئے"۔ روپیہ نکالکر دکھایا

بجائے خفا ہونے کے چیکر صاحب شاید اپنے حافظہ پر زور دیکر ہمیں پہچان گئے لیکن یاد نہ پڑتا تھا لہٰذا ہم نے اُنکی امداد کی اور بول اٹھے "غازی آباد"

اُنکے چہرہ سے پتہ چلا کہ ہمیں پہچان گئے اور کچھ غصہ بھی آیا مگر تھے سمجھدار آدمی اور کچھ نہ بولے ورنہ ہمارے ساتھ اسوقت کئی موذی تھے۔

وہ حضرت جو بے ٹکٹ تھے اب ہمنے انکی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "ٹکٹ چیکر صاحب دہلی ہمنے آپکو بلایا تو تھا ان حضرت کی وجہ سے کیونکہ انکا حکم تھا کہ ہم آپکو دیکھتے رہیں" کہکر ہمنے اپنا ٹکٹ پیش کیا اور ان سے ٹکٹ حضرت کو پکڑوا دیا قبل اسکے کہ وہ ہمارے ڈبہ کے تمام ٹکٹ چیک کریں ہمنے پہلا کام یہ کیا کہ حتی الامکان ہر خوانچہ والے کو قلی کو غرض جو بھی ریلوے سے تعلق رکھتا تھا کوشش کرکے ٹکٹ چیکر صاحب کے پاس یہ کہکر بھیجا کہ تم کو صاحب بُلاتے ہیں۔ کچھ دیر اس کا لطف رہا مگر حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوئی ہم ناکام لوٹ کر اپنی جگہ پر آئے تو دیکھا کہ ٹکٹ چیکر صاحب دوسری طرف کی بنچ پر بیٹھے ایک بابو صاحب سے باتیں کر رہے ہیں آپ یقین کریں کہ ہمیں باوجود باتونی ہونے کے چند قسم کی باتوں سے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ مثلاً جب کئی پولیس والے بیٹھکر رپٹ اور چالان اور گواہوں کا مسلسل تذکرہ چھیڑ دیں یا پھر ریلوے ملازمین آپس میں بیٹھکر "ٹوڈاؤن اور فوراپ" کر رہے ہوں۔ اس وقت یہی ہو رہا تھا اور ہماری جان ہی تو جل گئی۔ ٹکٹ چیکر صاحب ان بابو صاحب سے جو ریلوے ملازم تھے یہی باتیں کر رہے تھے۔

فوراً ہم اپنی گاڑی میں سے اُترکر دوسری گاڑی میں ہوکر اس طرف پہونچے اور دوسری طرف سے پہونچکر آہستہ سے اپنی گاڑی کے پائیدان پر چڑھے اور موقعہ دیکھکر ہم نے چیکر صاحب کی دونوں آنکھیں اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک دم سے بند کرلیں۔ وہ حضرت سمجھے کہ کوئی دوست ہے اور انھوں نے ہمارے ہاتھ ٹٹول کر اپنے دوستوں کے نام لینا شروع کئے "ڈیوڈ" "پارکر"

"میکی" وغیرہ وغیرہ مگر چونکہ ہم ان میں سے کوئی نہ تھے لہذا ہاتھوں کو زور سے دبایا تاکہ اونکو تکلیف ہو اور نوبت بہ اینجا رسید کہ ہم انکی آنکھیں پھوڑے ڈال رہے تھے کہ انہوں نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہمارے چھڑا کر جو ہمیں دیکھا تو بس جل ہی تو گئے۔ غضبناک ہو کر انہوں نے ٹکٹ چیک کرنے کی قینچی ہمارے ہاتھ پر اس زور سے ماری کہ ہم بلبلا ہی تو گئے۔ انہوں نے دوسرا حملہ کیا۔ لیکن ہم نے اُنکی قینچی پکڑ لی اور کھینچا تانی کرکے چیکر کو دھکا دیکر بھاگے فوراً گاڑی چل دی اور ہم نے ایک تیسرے درجہ میں داخل ہو کر ٹکٹ چیک کرنا شروع کر دئے۔

(۳)

جیسے ہی دوسرا اسٹیشن آیا ہم فوراً اُتر پڑے ہمیں اب صرف اپنے ہی ڈبہ میں پناہ مل سکتی تھی کیونکہ ہم خوب جانتے تھے کہ ٹکٹ چیکر صاحب ہمارا ڈبہ چھوڑ کر ہماری تلاش میں نکلیں گے ہم تیزی سے اُتر کر پشت کی طرف سے اپنی جگہ آ بیٹھے حسب توقع معلوم ہوا کہ ٹکٹ چیکر صاحب اور وہ بابوجی اُن سے باتیں کر رہے تھے اور ہمیں ٹکٹ چیکر صاحب کا پُرانا دوست سمجھکر بیٹھے اُنکی آنکھیں پھڑوا بیٹھے اور کچھ نہ بولے ہماری تلاش میں گئے ہیں ہمیں اپنے ساتھیوں سے معلوم ہوا وہ ہمیں پولیس میں دینے کو کہتے ہیں۔ ہم نے دل میں کہا کہ کچھ پرواہ نہیں۔ پاس ہو گئے ہیں ہرد کہا وے کو یہ پہونچ سکیں گے اس سے زیادہ نقصان ناممکن۔ چھٹیاں اب کے جیل ہی میں کاٹیں گے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ کام کیا کہ ٹکٹ چیک کرنے کا آلہ ٹکٹ چیکر صاحب کی گدی کے نیچے کھڑکی کے پاس ہی رکھدیا اور اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھ گئے ہمارے ساتھیوں نے پوچھا کہ اب وہ آتا ہو گا کیا کرو گے تو ہم نے بھی کہا کہ اوس نے ہماری انگلی پر جو قینچی ماری ہو اس کا بدلہ لیں گے۔ ہم ان حضرت سے غلط فہمی کی معافی مانگ رہے تھے جنہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ٹکٹ چیکر پر نظر رکھنا اور جنہیں ہم نے بے ٹکٹ ہونے کی وجہ سے پکڑوا دیا تھا کہ ٹکٹ چیکر

صاحب آگئے۔ ہم نے دیدہ و دانستہ انکی طرف سے نظر پھیر لی تھی کہ ہمارا ہاتھ انھوں نے زور سے پکڑا۔ ہم نے ڈپٹ کر اُن سے کہا "تم نے ہماری اُنگلی میں اپنی قینچی کیسے ماری؟"

"میں تمہیں پولیس میں دیدوں گا ورنہ تم میرا نیر (ٹکٹ چیک کرنے کی قینچی) لاؤ۔"

"نہیں دیتے۔" ہمنے تنکر کہا "تم نے ہمیں کیوں مارا؟" یہ کہکر ہمنے اپنی انگلی انکی چونچ کی طرف ایک دم سے بڑھا کر کہا "یہ دیکھو۔"

اتنے میں وہ دوسرے بابو صاحب جو اوں سے باتیں کر رہے تھے بولے کہ "بابو صاحب آپ نے جُرم کیا ہے۔"

"ارے!" ہم نے کہا "بھئی لینا ذرا انکے لعل ٹھونکنا۔"

جلکر وہ بولے "اجی بابو صاحب ذرا ہوش "

بات کاٹکر ہم نے کہا "تمہارے بابو کہیں جھک مار رہے ہونگے۔ اب کی مرتبہ اگر تم نے ہمیں بابو والو کہا تو یاد رکھو کہ مار کر بابو سے آدمی بنا دیئے جاؤ گے۔"

غرض بہت جلد تُو تُو کا فصیحتی ہونے لگی اور حیقلش کی صورت در پیش ہو نیوالی تھی کہ ہمارے ایک نالایق ساتھی نے دو ایک مسافروں کی امداد سے بیچ میں پڑکر ٹکٹ چیکر صاحب سے کہا کہ "لڑنے سے کوئی فایدہ نہیں اسٹیشن آجانے تو اِن سے سمجھ لیجئے گا۔" گاڑی چل رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مگر پھر صاحب سے ہم سے جھائیں جھائیں ہونے لگی اور ہم نے اب بہتر سمجھا کہ اُنھیں اور طرح تنگ کریں چنانچہ اُس سے پھر ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے تمام بحث چھوڑ کر روپیہ کے پیسہ مانگنے شروع کیئے۔ ایک کہتا کہ انہیں نہ دیجئیگا مجھے دیجئے گا اور دوسرا کہتا کہ مجھے دیجئے گا انکا روپیہ کھوٹا ہے تو تیسرا کہتا کہ مجھے ایک پیسہ کم دیجئے گا۔ غرض کوئی ہاتھ جوڑتا تو کوئی خوشامد کرتا کہ روپیہ کے پیسے مجھے دیجئے گا۔ تمام بحث اس طرح ختم ہوئی اور اب اگر خفا ہوں تو اس کا بھی یہی جواب کہ روپیہ

کے پیسے لاؤ۔ ضبط سے جب اُنہوں نے کام لیا تو ہم لوگ جگہ چھوڑ کر پیسے مانگنے پر تُل گئے اور پھر لڑائی ہونے لگی مگر اب لڑائی کی صورت ہی اور تھی۔ ہمارا حربہ اور ڈھال دونوں یہی حملہ تھا کہ روپیہ کے پیسے دیدیجئے۔

اتنے میں گاڑی کی رفتار میں ذرا کمی ہوئی تو ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اسٹیشن آ رہا ہے تم لوگ کھڑکی پر آکر ایسے جمع ہوجانا کہ ہم تو گاڑی رکتے ہی نکل جائیں اور ٹکٹ چیکر صاحب ایک لمحہ بھر کیلئے رُک جائیں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ ہم گاڑی رُکتے ہی فرار ہوگئے اور ہمارے ساتھی کھڑکی میں ایسے اُڑ گئے کہ ہمیں مُہلت کافی مل گئی۔ ٹکٹ چیکر صاحب کو کھڑکی سے نکلنے کے لئے زور لگاتا چھوڑ کر ہم بھاگے اور دوڑ کے ایک تیسرے درجہ میں گھسکر پاخانہ میں قلعہ بند ہوگئے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ٹکٹ چیکر صاحب نے ہمارا پتہ لگانے کی کیا کوشش کی۔ جب ریل چلی تو ہم اپنے قلعہ سے نکلے تو سخت گھبرائے کیونکہ وہ ناہنجار معہ ایک عدد کانسٹبل کے ہمارا منتظر ہی تھا، ہم نکلے ہی تھے کہ ٹکٹ چیکر صاحب نے کانسٹبل کو ہماری طرف شکاری کُتے کی طرح دوڑا دیا۔ بس شرط پر ہے اپنے کو محصورًا کانسٹبل کی حراست میں دیدیا کہ ٹکٹ چیکر صاحب الگ خاموش بیٹھے رہیں اور ہمیں ہاتھ نہ لگایا جائے اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہوگا دل میں سوچ رہے تھے کہ کہیں سچ مچ قید و دید نہ ہوجائیں۔ اتنے میں ایک آدمی نے بڑھکر کہا "میاں سلام کہاں جا رہے ہو؟ کیا معاملہ ہے؟" ہم نے سر اوپر کرکے اپنے چچا صاحب کے ملازم کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ چچی صاحبہ بھی ہماری ہم سفر ہیں اور پیری مریدی کے چکر میں روپیہ ضائع کر رہی ہیں اور لکھو جا رہی ہیں۔ دلمیں ہم سوچنے لگے کہ اگر گرفتاری سے بچ گئے تو بیان اور داستان کا ٹھیک ہو ہی گیا۔

(۴)

اسٹیشن آیا اور ہم اُتارے گئے۔ ایک خطرناک قسم کے اسٹیشن ماسٹر کے سامنے ہماری پیشی

ہوئی ہمارے ساتھی بھی اُتر آئے ۔ بہت جلد ہمیں اس مخمصہ سے خلاصی پالی کیونکہ دیکھا جائے تو واقعہ ہی کیا تھا ۔ صرف اتنا ہی تو تھا کہ ایک دوست کے دھوکہ میں چیکر صاحب کی آنکھیں ہم نے پیچھے سے بند کرلی تہیں ٹکٹ چیک کرنے کا نیر خود جہاں وہ بیٹھے تھے موجود ہی تہا اور روپیہ ہمیں پیسوں کی بیحد ضرورت تھی اور اب بھی ہم ایک پیسہ کم لیے کو تیار رہتے یہ سب کچھ تہا مگر ہری سے کام چلا اور ہمیں باضابطہ خوشامد کرنی پڑی اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگنی پڑی ۔ لیکن معافی مانگنے کے بعد ہم پھر بھی نہ مانے اور کہا کہ "ابتو روپیہ کے پیسے دیدیجئے "کیونکہ یہ دوسرے لہجہ میں کہا تہا لہذا ٹکٹ چیکر صاحب ہنس دیئے اور قصہ ختم ۔

یہ ٹکٹ چیکر صاحب اب بھی جب کبھی ملجاتے ہیں ان سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور ٹکٹ ہم سے کبھی نہیں مانگتے ۔

(۵)

اس گڑبڑ سے جب آیندہ کیلئے فرصت ہوگئی تو ہم چچی صاحبہ کی مزاج پرسی کیلئے دوسری اسٹیشن پر پہونچے ایک صاحب کوئی اور بھی کھڑے اپنے گھر کی عورتوں سے باتیں کررہے تھے ۔ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے کہ اس عورت نے انکو ایک لفافہ دیا تاکہ وہ لیٹر بکس میں ڈالدیں جو زنانہ درجہ کے سامنے ہی تہا معاً چچی صاحبہ کو یاد آگیا کہ ایک کارڈ انکے پاس بھی ڈالنے سے رہ گیا ہے چنانچہ انھوں نے نکالکر دیا اور ہم سے کہا کہ اسے ڈالدو وہ حضرت لیٹر بکس میں خط ڈالکر چلے گئے اور گاڑی نے سیٹی دی ہم بھی لپک کر کارڈ ڈالنے پہونچے کیا دیکھتے ہیں کہ لیٹر بکس کے منہ میں ایک لفافہ اٹکا ہوا ہے یہی لفافہ تہا جولا پرواہ حضرت اپنی دانست میں لیٹر بکس کے اندر ڈالکر گئے تھے ۔ ہم نے اس نیت سے اسکو نکالا کہ اپنا کارڈ ڈالکر اسکو بھی ڈالدیں ۔ قدرتی طور پر لفافہ کے پتہ پر نظر پڑی ایک دم سے ہمارے منہ سے نکلا "ارے" ریل نے سیٹی دی اور ہم نے کارڈ تو ڈالدیا مگر لفافہ جیب میں رکھکر اپنے درجہ میں بھاگ کر چڑھ گئے

آپ خود خیال کیجئے کہ کیونکر ہم اس لفافہ پر قبضہ نہ کرتے ۔ اس لفافہ پر پتہ ایک لڑکی کا درج تہا

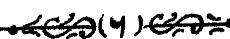
اور پھر لڑکی بھی وہ جو کہ ہمارے دستِ حق پرست پر مسلمان ہونے کے لئے منتخب کی گئی تھی۔
ایک طرف کو ذرا اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ہم نے خط جیب سے نکالا اور کھولکر اپنے اخلاقی گناہوں کی فہرست میں فوراً ایک اور گناہ کا اضافہ کیا۔ ہم اس خط کو پڑھکر حیرت میں رہ گئے کیونکہ خط کا مضمون ہی ایسا تھا جو بجنسہ درج ذیل ہے۔
"میری پیاری بہن زاھدہ۔
میں کس طرح تمہیں اپنی پریشانیوں کا حال لکھوں، اماں جان کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ آج ہم دلّی سے شام کو روانہ ہونگے ورنہ پھر کل صبح کی گاڑی سے تو ضرور ہی۔ پندرہ میں روز علاج رہا مگر کوئی افاقہ کی صورت نہیں۔ ڈاکٹری معائنہ سے معلوم ہوا کہ اماں جان کو دق تو نہیں ہے مگر خطرہ ضرور ہے۔ حکیم صاحب نے بھی یہی کہا مگر درصل انکی حالت ہی اور ہے۔ انکی وجہ سے میری بھی حالت خراب ہے۔ آگے وہ جائیں گے تو پیچھے میں جاؤنگی خدا جانتا ہے کہ زندگی سے اب جان تنگ ہے۔
یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں اور مفصل گھر پہونچکر لکھوں گی۔ کلکتہ والی سے صرف ایک روز دھلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ فقط"
یہ تو خط کا اصل مضمون تھا مگر خط کے حاشیہ پر پنسل سے جو عبارت تھی وہ ایک معمہ تھی حاشیہ پر لکھا تھا کہ "یہ خط اب ریل میں سے ڈلوا رہی ہوں۔ دہلی میں بھول گئی اسوقت میرا دل بیحد پریشان ہے کیونکہ ابھی ابھی میں نے اپنے اور اماں جان کے قاتل کو دیکھا جو اپنی چچی سے باتیں کر رہا تھا، مجھے اسکی صورت سے نفرت ہے اور دیکھنے سے اختلاج پیدا ہو گیا"
ناظرین غور کریں کہ ہمیں کیونکر اس خط سے دلچسپی نہ ہوتی۔ اول تو مکتوب الیہ ہماری بیوی معلقہ اور پھر اسپر یہ حاشیہ کی عبارت، ہم سخت چکرائے کیونکہ اپنی چچی سے تو ہم ہی باتیں کر رہے تھے۔

جب یہ خط ڈالا گیا تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ قاتل کون ہے کیونکہ ہمنے کوئی قتل وتل کبھی نہ کیا تھا، بہت سوچا لیکن کچھ معاملہ سمجھ میں نہ آیا ہم نے اب تہیہ کرلیا کہ ہر اسٹیشن پر اُتر کر چچی کے پاس جائیں گے تاکہ اپنے علاوہ کسی اور چچی کے بھتیجہ کو تلاش کریں۔ ہمیں اطمینان تھا کہ ہم ضرور اس معمہ کو حل کرلیں گے اور سوچ رہے تھے کہ کسی نہ کسی اسٹیشن پر تو وہ بھتیجہ اپنی چچی سے ہماری طرح باتیں کرنے آخر کو آئے ہی گا۔



ہم ہر اسٹیشن پر چچی کے پاس جاتے اور ساتھ ہی یہ بھی کوشش کرتے کہ خط لکھنے والی کی ایک جھلک دیکھ لیں مگر اوّل تو وہ برقعہ اوڑھے منہ چھپائے کھڑکی کی آڑ میں اور پھر چچی سامنے تھیں۔ ہوتے ہوتے کانپور کا اسٹیشن آگیا مگر باوجود ہماری کوشش کے اس بھتیجہ کا پتہ نہ چل سکا جن کی ہمیں اسقدر تلاش تھی رہ رہ کر ہم اپنے ہی کو تنہا بھتیجہ پاتے تھے بھتیجہ تو بھتیجہ کوئی بھتیجہ نما شخص تک زنانہ درجہ کے پاس نہ پھٹکا۔

کانپور کے اسٹیشن پر ہم نے اپنا اور چچی صاحبہ کا اسباب آسانی کیواسطے ملا لیا کیونکہ ہمارے ساتھ ہمارے تین اور ساتھیوں کا بھی اسباب تھا۔ یہاں ہمیں لکھنو جانے کے لئے اسٹیشن بدلنا تھا، ایک ہی گاڑی پر سب اسباب بار کرالیا گیا اور دوسرے اسٹیشن پر پہونچے۔ کانپور سے لکھنو پہونچ گئے مگر ان بھتیجہ صاحب کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ لکھنو کے اسٹیشن ہی پر سے ہم چچی صاحبہ سے رخصت ہوئے کیونکہ وہ سیدھی اپنے پیر کے یہاں جارہی تھیں۔



ہم اپنے دوست کے یہاں ٹھہرے گھر پہونچکر ہم نے اپنا سیاہ رنگ کا سوٹ کیس نما ٹرنک جو کھولا تو ہمارے تعجب کی کوئی انتہا ہی نہ رہی کیونکہ وہاں ہمارے سامان کے بجائے زنانہ کپڑے اور سنگار کی چیزیں تھیں ہم بہت گھبرائے اور اوپر نیچے چاروں طرف سے ٹرنک کو دیکھا یہ کسی اور کا تھا اور بدل گیا۔ ہمارا بھی سیاہ تھا اور یہ بھی سیاہ تھا۔ ہمارا بھی نیا تھا اور یہ بھی نیا تھا۔ اسمیں بھی اوپر کا تالا

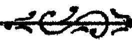
نہ تھا اور اسمیں بھی کوئی اوپری تالا نہیں پڑا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ حجی صاحبہ کے سامان میں ہمارا سامان مل گیا اور اسی میں یہ بدل گیا ہے مگر حجی صاحبہ کا یہ بکس ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ تو کسی فیشن ایبل چھوکری کا سامان معلوم ہوتا تھا نہ کہ ایک عمر والی عورت کا۔ ہمنے فوراً اس بکس کی تلاشی لی تو ہمیں اسمیں متعدد خطوط اور کاغذ ملے۔ ان خطوط کے پتے پڑھکر ہم چونکے خط ایک ایک کر کے ہم نے سب پڑھے اسمیں سب خط زاہدہ کے تھے یعنی اُس لڑکی کے جس سے ہماری شادی تجویز ہو رہی تھی علاوہ اسکے خطوں کے ایک لمبا چوڑا خط کا مسودہ ملا جو زاہدہ کو لکھا گیا تھا۔ اسکو ہمنے شروع سے آخیر تک پڑھا ہم پڑھتے جاتے تھے اور سناٹے میں آتے جاتے تھے خط پڑھ چکنے کے بعد ہم اپنا سر پکڑکر بیٹھ گئے۔ کیونکہ اب سارا معمہ حل ہو گیا۔ اس خط کے مسودہ نے راز کھولدیا یہ واقعہ تھا کہ وہ قاتل جسکا کہ ذکر اس خط میں تھا سوائے ہمارے کوئی نہ تھا! "یا اللہ اب میں کیا کروں" ہم نے تنگ آکر اور پریشان ہوکر کہا۔ ہم ایک عجیب فکر میں پڑ گئے۔ ایک عجیب خلجان تھا۔ بیشک ہماری ہی خطا تھی مگر اس خطا کی وجہ سے ہمیں قاتل کہنا کہاں تک درست تھا اسکا اندازہ ہم خاموش بیٹھے ہوئے لگا رہے تھے کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے علم میں آیا اگر وہ صحیح تھا اور بیشک تھا ہی، تو ضرور بالضرور اور بیشک یہ خوفناک لفظ یعنی "قاتل" ہمارے لئے بالکل سزاوار تھا مگر پھر بھی گنجایش تھی!

ہمارے پاس اب اسکا علاج کیا تھا جو ہم اپنی شرارتوں کے سلسلہ میں کرگذر رہے تھے شرارتوں کے سلسلہ میں اپنے سے زائد تیز شخص سے شکست کھا کر محض اپنی شرارت کے جواب کا بدلہ کمینہ پن سے لینے کے لئے جو کچھ ہم کر گذرے تھے۔ ہمارا ضمیر ہمارے فعل کے اوپر ملامت کر رہا تھا اور طبیعت کا یہ حال تھا کہ کسی طرح جو کر گذرے اس کی تلافی کیجائے۔ بہت کچھ سوچا مگر تلافی کی کوئی صورت ہی نظر نہ پڑتی تھی۔ سوائے ایک کے تلافی تو ممکن تھی مگر مرحلے طے کرنے تھے تاہم محض ضرورتھی فوراً دل میں ہمنے کچھ ٹھان لیا۔ وہاں "جانا فی العمل ملتوی کیا گیا۔ اور جا بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارا بہترین سوٹ اور

ٹائیاں اور کالر ہمارے ٹرنک میں تھے جو بدل گیا تھا اور بردکھاوے کیلئے ہمارے پاس جیسے کپڑے ہم چاہتے تھے ویسے نہ تھے۔ غرض بردکھاوے کو ملتوی کیا اور گھر یعنی والد صاحب کے پاس سیدھے جانے کی ٹھانی۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خط اور صندوق معہ سامان کے ہم نے ضبط کر لیا اور کسی طرح بھی کوشش نہ کی کہ اس صندوق کو دیکر اپنا صندوق واپس لیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے صندوق میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے ہمارا پتہ چل سکتا۔

ہم نے کیا خطا کی تھی اور کیا شرارت ہمارے ساتھ ہوئی تھی اور ہم نے کیا کمینہ پن کیا تھا؟ اور درحقیقت معاملہ کیا تھا؟ اور پھر ہم نے اپنے کئے کی کیا تلافی کی اور کس طرح کی؟ یہ سب باتیں درحقیقت بالکل پرائیویٹ ہیں اور قارئین کو نہیں بتائی جاسکتیں اور امید ہے کہ تمام قارئین شرافت سے کام لیتے ہوئے اس شکایت کا خیال ہی دل میں۔ لائیں گے کہ مضمون ادھورا اور نامکمل رہ گیا فقط۔



نوٹ

مندرجہ بالا قصہ تو یہیں ختم ہو گیا اور اگر کوئی اپنی پرائیویٹ معاملات صیغہ راز میں رکھنا چاہتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں اور ہمیں امید ہے کہ قارئین شرافت سے کام لیتے ہوئے اس شکایت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں گے کہ مضمون ادھورا اور نامکمل رہ گیا۔ مگر خوش قسمتی سے ہمیں ایک دوسرے ذریعہ سے کچھ واقعات معلوم ہوئے ہیں اور آیندہ ماہ میں ہم اس سلسلہ میں ایک محترمہ کی سرگذشت خود انکی زبانی پیش کریں گے جس سے ان واقعات پر کافی روشنی پڑ سکے گی۔



باب ۲

کولتار

(۱)

ایک روز کا ذکر ہے کہ دوپہر کا وقت تھا اور گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ ملازمہ کھانا پکا کر جا چکی تھی اور اماں جان بھی ایک جگہ چلی گئی تھیں وہ آج کل کچھ خرچ کی وجہ سے پریشان تھیں۔ کرایہ داروں نے کرایہ ابتک نہ دیا تھا اس وجہ سے روپیہ پیسہ کی طرف سے تکلیف تھی۔ گھر میں سوائے ہم دو ماں بیٹیوں کے کوئی نہ تھا۔ اور جب اماں جان بھی چلی گئیں تو میں نے مکان کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور وقت گذاری کے لئے اپنی بلی کے بچوں کا گھر بنانے لگی۔

اماں جان کو گئے ہوئے مشکل سے گھنٹہ بھر ہوا ہو گا کہ دروازہ پر کسی نے زور سے دستک دی "دروازہ کھولو" کوئی زور سے دروازہ کو پیٹ رہا تھا میں دروازہ کی طرف گئی تو پھر یہی آواز آئی میں نے دل میں کہا کہ الٰہی یہ کون ہے جو زور زور سے دروازہ پیٹ رہا ہے اور چلّا رہا ہے۔ دبے پاؤں آہستہ آہستہ دروازہ کے پاس پہنچی۔ دروازے میں سے کچھ دکھائی نہ دے سکتا تھا میں نے دروازہ سے کان لگائے اور باتوں سے فوراً معلوم کر لیا کہ ہمارے کرایہ دار لڑکے ہیں شاید کرایہ دینے آئے ہیں اتنے میں پھر دروازہ اس زور سے پیٹا کہ میں چونک سی پڑی اور پکار کر کہا "کرایہ لے لیجئے دروازہ کھولو ۔ کوئی ہے؟" میں چُپ رہی پھر آپس میں

باتیں کرنے لگے اتنا مجھکو معلوم ہی تھا کہ تین لڑکے ہیں۔ اور اسوقت بھی شاید تینوں ہونگے۔
اب میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں یہ جانتی ہی تھی کہ اماں جان کو روپیہ کی کتنی سخت ضرورت ہے اور وہ ماما سے کہہ بھی چکی تھیں کہ لڑکوں سے تقاضا کرکے کرایہ لے لینا ورنہ اگر موقعہ نکل گیا تو پھر دوسرے مہینہ تک انتظار کرنا پڑے گا۔ لڑکوں کا یہی دستور تھا کہ اگر کرایہ بجاتا تو وصول ہوتا سب خرچ کر ڈالتے تھے۔ غرض اماں جان کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی میں کھڑی دروازہ کے پاس سوچ رہی تھی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا "جب کرایہ لاؤ تو کوئی لیتا نہیں اور پھر شکایت ہوتی ہے کہ وقت پر نہیں دیتے"
دوسرا بولا "اس کا علاج یہ ہے کہ پندرہ دن بعد خوب پریشان کرکے کرایہ دیا جائے"
ایک اور بولا کہ "بس بس یہی ٹھیک ہے اب چلو" "چلو چلو" دونوں نے کہا۔
روپیہ پیسہ کی ضرورت بھی بُری چیز ہے میں نے جو یہ سُنا اور دیکھا کہ کرایہ وصول ہونا پھر مشکل ہو جائیگا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے بھی اندر سے آہستہ سے دستک دی یعنی کواڑ پر ہاتھ مارا "صاحب کرایہ لے لیجئے" کسی نے سخت بگڑ کر غصہ کے لہجہ میں کہا "ہم گھنٹہ بھر سے کواڑ پیٹ رہے ہیں"
اب میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں میں چپ رہی اور سوچ رہی تھی کہ پھر اُسی لڑکے نے کہا "اگر ماما نہیں تو دروازہ کی آڑ میں سے خود لے لیجئے ورنہ پھر آج ہم لوگ ایک جگہ جا رہے ہیں اور اس مہینہ میں ادا نہ کرسکیں گے"
اب ایسے موقعہ پر آپ خود خیال کریں کہ میں مجبور ہو گئی آڑ میں سے روپیہ لینے کے واسطے دروازہ کھولنے کو ہوئی کہ پھر رُک گئی "تو پھر ہم جاتے ہیں" اسی نے کہا۔ باقی دونوں لڑکے خاموش تھے۔ چاہئے تھا کہ میں کچھ زبان سے کام لیتی اور کہدیتی کہ پڑوس کو دیتے جاؤ اور جاتے ہو تو جاؤ۔

پھر خیال آیا کہ ایک چھوڑ تین لڑکے ہیں، دن کا وقت ہے۔ اور سر راہ کوئی نقصان نہیں، لاؤ کرایہ لے لوں کہ اتنے میں پھر انہوں نے کہا "او جھلو جی"۔ میں نے یہ سُنکر ورا کنڈی کھولدی اسکی آواز سُنکر اُسی لڑکے نے کہا "لیجئے"۔ میں نے دروازہ کو ذرا سا آہستہ سے کھولا اور اسکی منتظر ہوئی کہ کوئی روپیہ دے گا کہ بجری میں اکا ایکی دروازہ کے دونوں کواڑوں کو اس لڑکے نے ایسا دھکا دیا کہ دونوں دروازے ایک دم سے کُھل گئے اور میں تینوں لڑکوں کے سامنے کھڑی تھی! ہوش بھی بجا نہ ہوتے تھے کہ آمنا سامنا ہوتے ہی اس لڑکے نے جو سب سے آگے کھڑا تھا ڈپٹکر کہا "کولتار"۔ کیا بتاؤں کہ میرے کیسے ہوش گئے اور میں کیسی بدحواس ہو کہ گرتی پڑتی بے تحاشا بھاگی کہ ایک پرانے کوئلہ کے کستر میں اُلجھ کر گری اور میرے گرنے پر پھر اُس نے کہا "کولتار"۔ میں سنبھل کر دیوانوں کی طرح بھاگی۔ اور ڈیوڑھی کے دوسرے دروازہ کو تیزی سے بند کیا۔ ایسے میرے اوسان گم ہوئے تھے کہ شل ہو گئی تھی۔ تن بدن میں رعشہ سا تھا اور پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اس تیزی سے دل دھڑک رہا تھا کہ وہیں کی وہیں دروازہ سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ لڑکے جا چکے تھے اور تھوڑی دیر بعد جب ذرا دل کی دھڑکن بند ہوئی ہوش بجا ہوتے تو اوٹھی۔ لڑکوں کی اس کمینہ حرکت پر سخت غصہ آرہا تھا یہ بالکل غیر معمولی بات تھی۔ لڑکوں نے کبھی کسی قسم کی بات نہ کی تھی اور آج یہ میں دیکھکر سخت متعجب تھی اور اس غیر معمولی شرارت کیوجہ دریافت کرنا چاہتی تھی، چنانچہ سیدھی چھت پر پہونچی

(۲)

اماں جان مرحوم کے زمانہ میں اوپر کے دونوں کمرے ایک تھے، لیکن اُن کے مرنے کے بعد بیچ کا دروازہ اینٹوں سے چنوا کر سرا سر والا کمرہ الگ کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب بھی دونوں کمروں کے آگے کا چھجہ جو سڑک کی طرف تھا ایک ہی تھا۔ برائے نام چھجہ کو اس طرح علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ کہ لوہے کی چادر کی ایک دیوار سی کھڑی کر دی گئی تھی، وہ اس طرح کہ چادر میں سوراخ کرکے لکڑی کے

کھمبوں سے باندھ دیا تھا اور یہ کافی تھا کہ اِدھر کا آدمی اُدھر نہ جا سکے اور اُدھر کا اِدھر نہ آ سکے، لیکن یہ آڑ دیکھا جائے تو برائے نام ہی تھی کیونکہ لکڑی کے کھمبہ کو پکڑ کر چھجہ کے کٹھرے پر سے ہو کر اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر آنا کوئی زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ ہمارے کمرے کے چھجہ کے سامنے پردہ کے خیال سے چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں دبے پاؤں اس چھجہ پر پہونچی اور ٹین کے پاس کان لگا کر لڑکوں کی باتیں سننے لگی۔

لڑکے خوب ہنس رہے تھے اور مجھکو سخت عصہ آیا جب معلوم ہوا کہ میرا نام "کولتار" نہیں بلکہ "کولتار صاحب" رکھا گیا ہے میں نے غور سے لڑکوں کی شرارت آمیز باتیں سنیں اور مجھکو معلوم ہوا کہ یہ شریر میری آواز سُنکر آپس میں میری صورت شکل کے بارے میں اندازے لگایا کرتے تھے۔ اور آپس میں بحث کرتے تھے۔ اور اس بحث کو طے کرنے کے لئے عرصہ سے مجھکو کسی نہ کسی طرح دیکھنے کی فکر میں تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ آج اسوقت گھر پر سوائے میرے کوئی نہیں۔

اتنے میں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ملازم برف لایا۔ لوٹا اٹھانے اور پھر برف کو چھجہ پر دھونے کی آواز آئی۔ میں نے سوچا کہ اب جاؤں اور جانے ہی کو تھی کہ ایک دم سے ٹین کی پردہ کی دیوار کے پاس والی چق اٹھی اور اُسی شریر لڑکے نے اپنا سر ڈالکر جھانکا۔ اس کا میرا پھر آمنا سامنا ہو گیا اور اب کی مرتبہ تو اسقدر قریب سے کہ اگر ذرا بھی میں اور آگے کو ہوتی تو سر سے سر ٹکرا جاتا کیونکہ میں سڑک کی طرف منہ کئے کان لگاتے ہوئے تھی اور اسی طرف سے اُس نے اپنا سر ڈالا تھا۔ سامنا ہوتے ہی زور سے اس نے کہا "کولتار" اور اتنے قریب سے کہ اس کے مُنہ کا سانس میرے مُنہ پر لگا۔

میں اس دوسری شرارت کے لئے قطعی تیار نہ تھی اور ایسی لوکھلائی کہ گرتے گرتے بچی

اور فوراً اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کرکے بیدم ہوکر پلنگ پر گر پڑی برابر کے کمرے سے ہنسنے اور تیری سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جب ذرا طبیعت ٹھکانے ہوئی تو میں نے اب اس دروازہ سے کان لگائے جو اینٹ سے چُن دیا گیا تھا۔ جب کچھ صاف نہ سنائی دیا تو میں نے ایک جگہ سے بہت آسانی سے ایک بڑی سی کیل سے سوراخ کرلیا کیونکہ صرف ایک اینٹ کی دیوار تھی اور اسی جگہ میں پہلے بھی سوراخ کرنیکی کوشش کرچکی تھی۔

اب اس چھوٹے سے سوراخ میں سے دیکھا کہ دو لڑکے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ تیسرا ذرا الگ تھا اور اسکی صرف ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھ میں دودھ کے شربت کے گلاس تھے اور دونوں گلاسوں میں برف بجا بجا کر اطمینان سے باتیں کر رہے تھے اور شربت پی رہے تھے، اب میں نے باتیں اطمینان سے سُنیں۔

اُسی شریر نے باتوں کے سلسلہ میں کہا "لاحول ولاقوۃ، تم بھی عجیب آدمی ہو" دوسرے نے کہا "جی ہاں۔ جو وہ اپنی ماں سے کہدے تو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا" اس شریر نے اپنا گلاس مُنہ سے ہٹا کر کہا "کیا ہوگا؟ یہی کہدینگے کہ صاحب ہم نے آواز دی اور جب کُنڈی کھلی تو ہم نے یہ جان کر کہ ملازمہ ہے دروازہ کھولدیا۔ اس میں بھلا ہماری کیا خطا۔ گلی کا معاملہ۔ راہ گیر بھی ہونگے، بھلا کوئی شرارت ایسی جگہ ممکن ہے کسی کو گماں بھی نہیں ہوسکتا"

"خیر جناب یہ کوئی نہ مانیگا" اس نے کہا۔

"مت مانے دو جی" اس نے لاپرواہی سے کہا "کیا میں نے اسے کھالیا؟" اس نے زور سے ہنسکر کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ آج موقع خوب ہے اور سوائے "کولتار صاحب" کے گھر میں کوئی نہیں"۔

اسیر تیسرا بولا "بھئی انصاف کی بات تو یہ ہے کہ کالی تو ہے نہیں اور "کولتار" نام ٹھیک نہیں۔ کچھ جچتا نہیں۔"

"یہ کہنے!" زور سے اس نے قہقہہ لگا کر کہا "تم خود بلیک جاپان (Black Japan) (ایک سیاہ ولایتی روغن) ہو۔ . . . "

اس پر ایک قہقہہ لگا اور اس نے کہا "۔ چنانچہ اب ہمارا ارادہ ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی کا پیغام دیں . . ." پھر زور سے قہقہہ لگا اور ادھر میرا مارے غصہ کے بُرا حال، میں نہایت ہی نفرت آمیز غصہ سے اس شریر کو دیکھ رہی تھی۔

پھر اس نے کہا " ہم پیغام دیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ صاحب ملا لو اگر ہمارا لڑکا کالو بیچ میں کم ہو تو دام واپس!" پھر زور سے قہقہہ لگا۔

اس "بلیک جاپان" کا خطاب پا کر بیچارے حضرت نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی میں تو کالا ہوں اور مانتا ہوں مگر وہ کالی نہیں۔ ہرگز نہیں، اچھا کھلتا ہوا رنگ ہے بلکہ . . ."

"بلکہ خوب گوری چٹی سرخ و سفید یورپین کی نانی ہے" اس نے طنزاً جملہ پورا کیا۔ اس پر پھر ہنسی ہوئی۔

پھر کہا "ارے میاں تم تو احمق ہو۔ مانا کہ وہ کالی نہیں اور گوری ہے۔ مگر ذرا یہ نہیں دیکھتے کہ بے ایمان نکلی۔"

*

وہ کیسے؟" بلیک جاپان صاحب بولے۔

اس شریر نے کہا "وہ ایسے کہ آواز سنکر عرصہ سے جو خیال اس کے بارہ میں ہم نے اپنے دل میں قائم کیا تھا اس سے بالکل ہی مختلف۔ ذرا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم تو سر پر تو باندھ کر جائیں اس

نیت سے کہ بڑی حسین گوری چٹی سُرخ وسفید چادر کے ٹکڑے کو دیکھیں گے۔ اور وہاں ہمیں معمولی لڑکی دیکھنے کو ملے تو تم ہی انصاف سے کہو کہ منہ سے "کولتار" نہ نکلے تو اور کیا نکلے، جیسا اس کی آواز سے ہمے اس کو اپنے دلمیں سوچا تھا اس کی بہ نسبت واقعی کولتار ریا یا لہذا مُنہ سے بھی کولتار نکل گیا اور پھر اسکو ہمارے اپنے قایم کردہ میعار سے گورا کہنا تو واقعی جُرم ہے اور جُرم بھی کیسا . . قابل دست اندازی پولیس"۔

ملیک جایان صاحب بولے "یہ اور بات ہے مگر کالی تو ہیں"۔

میری بلّی سامنے کُرسی پر بیٹھی تھی اور ان باتوں کو چھوڑ کر اس نے کہا "بھئی کولتار صاحب کی بلّی کو تھوڑا شربت اور دو"۔ یہ کہکر اس نے ایک پیالی بلّی کے آگے رکھدی اور تینوں نے تھوڑا تھوڑا اپنے گلاسوں میں سے بلّی کو دیا۔ اب میں نے اس لڑکے کو دیکھا جس کا نام ملیک جایان تھا کیونکہ اٹک پہ آڑ میں تھا۔ اس کا رنگ واقعی سانولا تھا۔ بقیہ دونوں بھی اچھی خاصی صورت شکل کے لڑکے تھے۔ جس نے یہ تمام شرارت کی تھی اور میرا نام کولتار رکھا اس کا رنگ ذرا زیادہ صاف تھا ناک نقشہ بھی اچھا تھا مجھکو تسلیم کرنا پڑا کہ مجھ سے کہیں زیادہ اس کا رنگ صاف ہے یہ سب کچھ تھا مگر اسوقت اسکی صورت پر ایک کمینہ پن برس رہا تھا۔

اب دوسری باتیں ہونے لگیں اور کچھ کھانے پکانے کا قصہ شروع ہوگیا میں چلنے کو ہوئی کہ پھر رُک گئی کیونکہ پھر اسی شریر نے کہا "کیوں بھئی کیا رائے ہے آج کولتار صاحب کی دعوت رہے"۔

اس کے چہرے پر شرارت برس رہی تھی اور آنکھوں میں تیزی تھی جس سے میں صاف سمجھ گئی کہ اب پھر یہ کوئی شرارت سوچ رہا ہے۔ "وہ کیسے؟" دوسرے نے کہا۔

"وہ ایسے کہ آج رات کو کھیر پکے اور کولتار صاحب کو بھی کھلائی جائے"۔

"شاید بُرا مانیں اور واپس کردیں"۔

اس نے کہا "ہمیں انہوں نے عید پر سیویاں بھیجی تھیں اور پھر اکثر کچھ نہ کچھ بھیجا کرتی ہیں اگر انہوں نے کھیر واپس کردی تو آیندہ ہم بھی اُن کے ہاں کی کوئی چیز نہ لیں گے۔"

چنانچہ یہ طے ہو گیا کہ کھیر کے پیالے آج میرے لئے بھیجے جائیں گے۔ میں نے دل میں جل کر کہا کہ اگر واپس نہ کرائے تو کوئی کام نہ کیا۔

اس کے بعد میں نے کمرہ بند کردیا اور نیچے چلی آئی۔ نیچے آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں ڈیوڑھی میں جاکر بڑا دروازہ بند کردیا۔

اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ آج اس شرارت کا ذکر اماں جان سے کروں یا نہ کروں۔ مجھکو دراصل اس بات پر بہت غصہ آرہا تھا کہ اس شریر نے میرا نام کولتار رکھدیا۔ آج تک کسی نے مجھکو کالا تو کالا سانولا تک نہ کہا تھا۔ قدرتی طور پر میں لڑکوں کی آپس کی باتوں کا خیال کرکے غور کر رہی تھی کہ کیا واقعی میں کالی ہوں۔ آئینہ کے سامنے جاکر کھڑی ہوئی۔ دیر تک دیکھتی رہی اور غور کرتی رہی کچھ خیب سی ہوگئی نہ اس وجہ سے کہ میرا اپنا رنگ و روپ کچھ کالا یا پھیکا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ شاید مجھے "کولتار" کہنے والے کا رنگ مجھ سے زیادہ کھلتا ہوا تھا۔ پھر بھی مجھکو رہ رہ کر سخت غصہ آرہا تھا۔

شام کو ملازمہ آئی تو فوراً میں نے اسکو کرایہ وصول کرنے بھیجا۔ میں وضو کر رہی تھی کہ ملازمہ ایک رقعہ لیکر آئی۔ رقعہ کبھی نہ آتا تھا میں نے بھیگے ہاتھوں ہی سے رُقعہ دیکھا تو اس پر لکھا تھا "کرایہ بابت ماہ مئی" یہ لکھنے کی بھلا کیا ضرورت۔ رُقعہ میں نے پھینکدیا۔ وہ اُڑکر نیچے گرا مگر میں نے پھر اُٹھایا۔ کیونکہ اسکی پشت پر بھی کچھ لکھا تھا میں جل ہی تو گئی جب میں نے دیکھا کہ جلی قلم سے لکھا ہے "کولتار صاحب" میں نے جلکر رقعہ پھینک دیا مگر پھر اٹھالیا کہ ملازمہ اماں جان سے کہے گی کہ ایک رقعہ اور کرایہ لاکر دیا تھا۔ رقعہ اماں کے بغیر دکھائے پھاڑنا نہ چاہیئے۔

مارے فارغ ہونے کے بعد باورچیخانہ میں گئی۔ بلی چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی غور سے دیکھا تو اس کے سرخ ساٹن کے پٹے پر چاروں طرف لفظ "کولتار" لکھا ہوا تھا۔ مجھے غصہ میں بلی کو پیٹ ڈالا کہ کمبخت وہاں جاکر کیوں مرتی ہے۔ پکڑ لے گئی اور سرخ پٹہ یا گھولکر کوستی گئی اور تحریر مٹاتی گئی۔ مجھکو بیحد غصہ آرہا تھا۔ بلی کو چھوڑا ہی تھا کہ اس کے سفید سفید پیٹ پر نظر پڑی۔ روشنائی سے بڑے بڑے حروف میں بڑی اُستادی سے اس طرح بال رنگے گئے تھے کہ صاف کولتار تحریر تھا۔ مارے کھسیانہ پن اور غصہ کے میری آنکھوں میں سے آنسو نکل آئے، پہلے تو بلی کو خوب پیٹا اور پھر پانی سے بڑی مشکل سے مال رگڑ رگڑ کر مٹایا۔ غصہ پھر بھی نہ گیا۔ بڑی دیر تک مجھکو ان حرکتوں پر غصہ آیا کیا۔ اور سوچ رہی تھی کہ اماں جان سے کہکر اس شریر کو نکلواؤں گی۔

شام کو اماں جان آگئیں میں نے بہت چاہا کہ کہدوں۔ بار بار ہمت کرکے آتی۔ ایک مرتبہ تو مخاطب ہی کرلیا مگر کہتے کہتے رہ گئی۔ زباں ہی بند ہوگئی کچھ اور بات کہکر ٹالدیا۔



رات کو ملازمہ جانے والی ہو رہی تھی کہ کسی نے دروازہ پر آواز دی۔ میں نے آواز پہچان لی۔ لڑکوں کا نوکر تھا۔ اف مجھے یاد آیا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ماما ایک سینی لئے چلی آرہی ہے۔ میں سمجھ گئی کہ کھیر ہے۔ میں کچھ بیچین ہو کر گھبراسی گئی اور وہ محض اسوجہ سے کہ جانتی تھی کہ مجھے بھیجی ہے۔ اماں جان سے ملازمہ نے کہا "لڑکوں نے سلام کہا ہے اور یہ کھیر بھیجی ہے" میں نے فوراً اماں جان کو صلاح دی کہ واپس کردو۔ یہ کیسی کھیر ہے۔ اسپر ماما بولی "نوکر نے کہا ہے کہ لڑکوں نے کسی تمہید کی نیاز دلوائی ہے"۔ میں پھر بھی نہ مانی اور اماں جان سے میں نے اصرار سے کہا کہ کھیر واپس کردیں۔ جب میں نے بہت کہا تو اماں جان نے محبت سے کہا "نہ بیٹی نذر کی کھیر ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ کوئی تو محبت سے تحفہ بھیجے اور ہم واپس کردیں۔ یہ کوئی ڈھنگ نہیں"۔ لیکن میں نے

پھر ضد کی اور کہا کہ "پردیسیوں کا خواہ مخواہ کا احسان ہم کیوں لیں۔"
اماں بولیں "ایسا ہی ہے تو تم خود کبھی احسان اُتار دینا۔"
میں نے جلکر کہا۔ "ان کمبختوں کا ہم احسان ہی کیوں لیں جو اتارنے پھریں۔"
اس پر اماں جان کچھ خفا ہو کر بولیں۔ "ایسا ہی ہے تو پھینکدے مگر میں واپس نکرونگی۔"
مجبوراً اس بڑبڑاتی ہوئی لوٹی اور لالٹین لیکر پیالے نعمت خانہ میں رکھنے لگی۔ پیالوں پر چاندی کے ورق تو نہ تھے، لیکن پستہ کی باریک ہوائیاں ضرورت سے زیادہ چھڑکی ہوئی تھیں۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو بس جل ہی تو گئی کیونکہ چاروں پیالوں پر نہایت ہی صفائی سے بڑے بڑے حروں میں پستوں کی ہوائیوں سے لفظ "کولتار" لکھا ہوا تھا۔ جلدی جلدی میں نے انگلی سے پستہ کی ہوائیاں ادہر اُدہر کرکے تحریر بگاڑ دی۔ میں غصہ میں سلگ رہی تھی اور پیالوں کو رکھکر بڑبڑاتی ہوئی پلنگ پر جا بیٹھی۔ اماں جان نے مُلا رمہ سے کہا "کہدیا کہ دعا کہی ہے۔"
اماں جان نے دعا کہلوائی اور میں کوس رہی تھی کہ دیکھو تو اس شریر نے کیا میرا پیچھا لیا ہے کہ اتنے میں ملا رمہ سینی دیکر واپس آئی اور کہا کہ لڑکوں کا ملازم ڈیوڑہی پر کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ لڑکوں نے کہا ہے کہ "تھوڑا سا ہمیں کولتار دیدیجئے سخت ضرورت ہے۔" یہ سنکر میں آپے سے باہر ہوگئی اور جلکر میں نے کہا "کہدو زیادہ بدتمیزی نہ کریں۔ یہاں کولتار کہاں سے آیا!"
اماں جان بولیں "بیٹی تجھے کیا ہوگیا ہے۔ خواہ مخواہ کی لڑکوں سے دشمنی ہوگئی ہے؟ آخر ہمسایت سے کام کیوں نہیں لیتی۔" بھلا میں اس کا کیا جواب دیتی اور کس طرح اماں جان سے کہتی کہ یہ شریر مجھ کو کولتار کہہ رہے ہیں اور در اصل مجھکو چھیڑ رہے ہیں۔
اماں جان نے ملا رمہ سے کہا کہ "جاکر کہدو کہ ہمارے یہاں کولتار نہیں ہے۔"
ملا رمہ چلی گئی اور لوٹ کر آئی تو کہا "ملازم کہتا ہے کہ لڑکوں نے کہا ہے کہ "ہم نے آج ہی

خود ڈیوڑھی میں دیکھا تھا۔" یہ سُنکر میں دھک سے ہوگئی کہ یا اللہ یہ کیا ستم ہو رہا ہے۔ کہیں یہ شریر
صاف صاف خود نہ کہدیں کہ یہ یہ معاملہ ہے اور ہمے کولتار نام رکھا ہے، میرے مُنہ سے اب بات
نہ نکل رہی تھی۔ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ میرا اسوقت کیا حال ہوا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ڈر
تھا کہ نہ تو میں نے مُلا رمہ سے کہا تھا اور نہ ماما سے کہا تھا کہ انکی غیر موجودگی میں دروازہ پر لڑکے
آئے تھے۔ لیکن غصہ ڈر پر غالب آیا اور میں نے جل بُھنکر کہا "کمبخت پاجی پن اور کمینہ پن
کر رہے ہیں"۔

میری بدزبانی پر اماں جان بگڑ کھڑی ہوئیں اور مجھے سیکڑوں باتیں سُنا ڈالیں کہ
کنواری ہوکر ڈیڑھ ہاتھ کی زباں لئے پھرتی ہے۔ میں دن بھر چھیڑی گئی تھی ویسے ہی چڑچڑی ہو
رہی تھی اماں جان کی سخت و سست باتوں کو برداشت نہ کرسکی اور کونہ میں مُنہ چھپا کر
خوب روئی۔

اماں جان نے لڑکوں سے کہلوا دیا کہ کولتار نہیں ہے۔ انکو خیال گذرا کہ ڈیوڑھی میں لڑکوں
نے کوئلوں کا پیپہ دیکھا ہوگا جس میں میں الجھ کر گری تھی اور لڑکوں سے بھی یہی کہوا دیا کہ "وہ ٹین
درصل کوئلوں کا ہے کولتار کا نہیں ہے"۔

(۳)

دوسرے روز کا ذکر ہے کہ مجھکو گذشتہ دن کے واقعات کا خیال بھی نہ تھا کہ میں باورچی
خانہ میں گئی۔ میری بلی آئی۔ میں نے تو دیکھا بھی نہیں اماں جان نے کہا "یہ بلّی کے گلے میں کاغذ
کیسا ہے؟" میں دھک سے ہوگئی۔ لڑکوں کے ساتھ بلّی روزانہ ناشتہ کرنے جاتی تھی۔ کاغذ
میں نے بلّی کے پٹّے میں سے نکالا۔ اسپر سیکڑوں جگہ تیزی سے خط شکست میں "کولتار" لکھا
ہوا تھا۔ میں نے بلّی کو گھونسا مار کر کہا "کمبخت روزانہ وہیں جاتی ہے اور اپنی گت بنواتی ہے"۔

یہ کہکر کاغذ اماں جان کو دیدیا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھکر لاپرواہی سے مڑوڑکر پھینکدیا۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پھر ہی سے لیکر پھٹاہی کاٹ دیا کہ کہیں پھر یہی شرارت ہو۔

تھوڑی دیر بعد جو چھت پر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ دیوار کے پاس بہت سی ردّی کاغذ کی مڑوڑیاں پڑی ہیں غیر معمولی طور سے جو میں نے انکو یہاں دیکھا تو اس سے ایک کو اُٹھا کر پڑھا وہی شرارت تھی یعنی اسپر "کولتار" لکھا ہوا تھا۔ دوتین اور ردی کے ٹکڑے دیکھے سب پر یہی لکھا تھا۔ یہ کوڑا اُس طرف سے دیوار پار میری طرف محض مجھکو تنگ کرنے کے لئے پھینکا گیا تھا ایک دفعہ دل میں تو آیا کہ پھر واپس اُدھر ہی پھینکدوں مگر کچھ سوچکر سب کو جمع کر کے کوڑے میں ڈالدیا۔ میں کمرے میں پہنچی اور سوراخ میں سے دیکھا تو وہ حضرت کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اسوقت میں نے ان کو اطمینان سے دیکھا۔ میرے برابر یا مجھ سے کچھ کم عمر تھے حالانکہ کتاب پڑھ رہے تھے مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ لڑکا کیا ہے شرارت کی پُڑیا ہے۔ میں نہیں بیان کرسکتی کہ میں اس شخص سے کیسی نفرت کرنے لگی تھی اور مجھکو تمام باتوں کا خیال کر کے کسقدر غصہ آتا تھا۔

اس تیرے دس پندرہ روز میری جان وہ مصیبت میں رہی کہ بیان نہیں کرسکتی۔ اپنے کمرے کی جتنی ردّی ہوتی اس پر لفظ "کولتار" لکھ لکھ کر میری طرف پھینکدیتے بلی کا پٹّا کٹ گیا تو اسکی دم میں ڈورے سے کاغذ باندھکر اس پر بیسیوں جگہ کولتار لکھدیا جاتا پھر اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ میرے پیچھے پر آکر کوئلہ سے تمام دیوار پر "کولتار" ہی "کولتار" لکھ مارا۔ بس کوسے دیتی جاتی تھی اور مٹاتی جاتی تھی۔ میرے مٹانے سے اور ضد سی ہوگئی۔ بار بار مٹاتی اور بار بار وہ لکھ جاتے طرہ یہ کہ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ان کے ساتھی ان حرکتوں کو منع کرتے مگر

وہ بھلا کاہیکو کسی کی سنتا تھا۔

مجھکو بھی تھوڑی بہت کریدی ہوگئی تھی کہ دیکھوں یہ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں اکثر ان لوگوں کی باتیں جا جا کر سنا کرتی تھی اکثر اپنا ذکر سنتی تھی ایک روز میں نے سنا کہ وہ حضرت میری شان میں قصیدہ پڑھ رہے ہیں تمام اشعار میں طرح طرح سے لفظ کولتار کا استعمال کیا گیا تھا تمام واقعات کو نظم میں لکھنے کی کوشش کی گئی تھی بعض اشعار تو واقعی ایسے تھے کہ باوجود سخت غصہ کے مجھکو بھی ہنسی آگئی مگر زیادہ تر تمام اشعار ایسے تھے کہ میں سن سنکر لال پیلی ہو رہی تھی جب شاعری ختم ہوگئی تو معلوم ہوا کہ یہ قصیدہ پورا کا پورا میرے چھجہ کی دیوار پر کل دوپہر کو چسپاں کر دیا جائیگا۔

تھوڑی دیر تک میں اُن کی حماقت آمیز گفتگو سنا کی پھر چلی آئی اور دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ تمام سلسلہ چھیڑ چھاڑ کا اس وجہ سے اور بھی ہے کہ میں چھجہ کی دیوار کی تحریر مٹا دیتی ہوں۔ اب یہ سوچی کہ چھجہ پر جاؤنگی ہی نہیں خود تھک کر چھوڑ دیں گے۔ کمرہ بند کر کے میں نیچے جانے ہی کو تھی کہ میرے ایسی بلی کو بڑی تیزی سے سامنے کے پاخانہ میں جاتے دیکھا یہ پاخانہ بالکل استعمال نہ ہوتا تھا اور میں یہ دیکھنے کو گئی کہ بلی دوڑتی ہوئی کیوں گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک قدمچہ پر بلی بیٹھی ہوئی ہے اور سامنے طاق کو دیکھ رہی ہے۔ جو روشندان کی طرح آرپار کھلا ہوا تھا میں نے جو طاق کی طرف دیکھا تو مجھے پھریری سی آئی کیونکہ طاق کے بیچوں بیچ میں پیلی بھڑوں کا ایک بڑا سا چھتہ لگا ہوا تھا۔ یہ چھتہ بالکل گول تھا اور اس پر اتنی بھڑیں لپٹی ہوئی تھیں کہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے میرا خیال نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچا اور میں کچھ سوچکر چلی آئی۔

(۴)

رات کو میں چپکے سے اٹھی اور ایک بڑا سا ٹین کا ڈبہ لیکر اوپر پاخانہ میں پہنچی۔ اندھیرا



کچھ ... زیادہ نہ تھا اور ... میں چھتہ لگا ہوا صاف نظر آرہا تھا میں کچھ ہچکچائی مگر پھر ہمت کرکے آگے بڑھی اور چھتہ کو صفائی سے ڈبہ میں لیکر اپنی طرف تیزی سے گھسیٹ کر فوراً ڈھکنے سے بند کر دیا۔ اب پورا کا پورا چھتہ مع بھڑوں کے ڈبہ میں بند تھا۔ کان سے لگا کر میں نے بھڑوں کی بھنبھناہٹ سنی اور میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ڈھکنے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی کیونکہ یہ ڈھکنا اس ڈبہ کا نہ تھا بلکہ کسی دوسرے ڈبہ کا تھا۔ کمرے میں آکر میں نے اس پر سیاہی سے بڑے بڑے حرفوں میں "کولتار" لکھ دیا۔ آہستہ سے دروازہ کھولکر میں نے اس آفت کے کے ڈبہ کو دیوار کے پاس ہی رکھ دیا اور واپس چلی آئی۔

میں جانتی تھی کہ کس وقت ان لوگوں کو فرصت ہوتی ہے۔ دراصل تمام شرارتیں مدرسہ سے آکر کھانا کھانے سے پہلے ہی کرتے تھے چنانچہ دوسرے روز میں اس تماشہ کو دیکھنے کمرہ پر پہونچی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا اور کئی مرتبہ میں نے ارادہ کیا کہ ڈبہ ہٹالوں زیادہ مجھکو انتظار نہ کرنا پڑا۔ گلی میں سناٹا تھا اور وہ حضرت اب موقعہ پاکر اس طرف چھجہ کی دیوار پر قصیدہ چسپاں کرنے پہونچے ٹین کے اس طرف آنے کی صاف آہٹ بھی سنائی دی۔ کیونکہ میں کان لگائے ہوئے تھی اور حق کے گرنے کی آواز کے ساتھ پیر کی آہٹ بھی سنائی دی۔ اب میں منتظر تھی کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ چھجہ پر آئے تھے تو عقل اپنے کمرہ میں چھوڑ آئے تھے۔ ایک دم سے میں نے ایک دبی ہوئی چیخ اور پیر پٹکنے کی آواز سنی اور ساتھ ہی اس کے دبی اور گھٹی ہوئی آوازیں اور منہ پیٹنے کی تڑاتڑ جیسے طمانچے پڑ رہے ہوں۔ بوکھلا کر ساتھیوں کو پکارا تمام ضبط رخصت ہو اور ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ معلوم ان کے ساتھی کیا کر رہے تھے۔ مگر یہ حضرت چھجہ پر پینترے بدل رہے تھے۔ ساتھیوں کا دبی آوازیں خود غل مچا کر ان سے کہنا کہ غل نہ مچاؤ اور اپنی آواز کو دبانا

اورکود دبا اور بلبلا یا۔ درحصل بیچارے بُری طرح گھرے تھے۔ اُدھر تو بھڑیں غصّہ میں بھری ہوئی اُدھر
چہرہ پرچقیں پڑی ہوئی گویا بھڑوں کے ساتھ یہ بند ہوگئے تھے۔ پریشان ہوکر جھٹ سے کمرے کا میرے
کمرے کا دروازہ پیٹنے لگے۔ جیتم روں میں اس بُری طرح دروازہ کو دھڑ دھڑایا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہیں یہ
کُھل نہ جائے۔ کیونکہ صرف اُوپر کی چٹخی لگی ہوئی تھی جو دیسے بھی ڈھیلی تھی۔ نیچے کی بگڑی ہوئی تھی اور لگتی
ہی نہ تھی۔ میری نظر چٹخنی پر تھی اور میں کمرہ بند کرکے جانے والی ہو رہی تھی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ چٹخنی ضرور
کُھل جائیگی۔ لیک کر میں دروازہ کے پاس پہونچی کہ جلدی سے چٹخنی مضبوط کرکے پیچھے جاؤں کہ ان حضرت
نے اوپر سے اس زور سے دھکا دیا کہ دروزہ کُھل گیا اِدھر سے میں تیزی سے پہونچی اور اُدھر سے وہ بھڑوں
سے بچنے کو گھسے بس ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ مگر واہ ری طبیعت کہ اس مصیبت میں بھی شرارت نہ چھوٹی۔
دیکھتے ہی مجھکو "کولتار" کہکر بُری طرح جھپٹا۔ خیر گذری ورنہ اس شریرنے مجھکو پکڑ ہی لیا ہوتا۔ اس کا اندازہ
لگانا مشکل ہے کہ میں کس طرح بھاگی اور جھٹ سے کمرہ کا دروازہ بند کرکے سیدھی نیچے پہونچی ڈھیاں
کا سانس جب لیا جب اماں جان کو بدستور سوتے پایا۔

جب کافی دیر ہوگئی تو میں پھر اوپر پہونچی کمرہ کو خالی پاکر اچھی طرح بند کیا۔ سوراخ میں سے جھانککر
دیکھا تو میری طبیعت بیحد خوش ہوئی۔ سارا منہ جناب کا سُوج کر کُپا ہو رہا تھا۔ کچھ دوا لگائی جا رہی تھی۔
اور دونوں ساتھی مذاق اڑا رہے تھے۔ آئنہ ہاتھ میں لئے کہہ رہے تھے کہ اس کا بدلا ایسا لیا ہو کہ
یاد ہی کرے۔ اور ساتھی یہ کہہ رہے تھے کہ اب بُھول کر اس طرف رُخ بھی نہ کرنا۔ اُس روز کے بعد
تمام جوش اُنکا رخصت ہوگیا۔ اور میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔

کچھ دنوں تک تو ایسی شرارت کا لطف اٹھانے کی نیت سے جاکر سوراخ میں سے جھانکتی
بھی تھی۔ لیکن پھر یہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی تمام باتیں آئی گئی ہوگئیں۔ لیکن اتنا ضرور رہا
کہ مجھے جب کبھی بھی ان باتوں کا خیال آتا تھا تو طبیعت خوش ہو جاتی تھی کہ میں نے بھی خوب

سبق پڑھایا۔

(۵)

جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں تمام باتیں رفت گذشت ہو چکی تھیں اور پانچ چھ مہینے بعد انکا خیال بھی پرانا ہو گیا تھا کہ ایک نیا ہی شگوفہ کھلا۔

بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے میری شادی دو جگہ لگ کر چھوٹ چکی تھی اب تیسری جگہ طے ہوئی تھی جس کے ساتھ میری شادی طے ہوئی تھی وہ علیگڈھ میں بی اے میں پڑھتا تھا اماں جان کو جتنی میری شادی کی فکر تھی شاید ہی کسی ماں کو ہو۔ جب دو مرتبہ میری شادی طے ہو کر چھوٹ گئی تھی تو میں دیکھ چکی تھی کہ ان کا کیا حال ہوا تھا اب ان کے رونے اور پریشان ہونے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ دو مرتبہ وہ صاحب آئے جن کی معرفت یہ شادی طے ہو رہی تھی، بڑی دیر تک باتیں ہوا کیں، نتیجہ بہت جلد صاف معلوم ہو گیا۔ مُلا زمہ کے بڑبڑانے سے مجھے اصلیت کا علم ہوا۔ دبی زبان سے کام کرتے ہیں وہ لڑکوں کو بُرا بھلا کہتی جاتی تھی۔ لڑکوں کے ذکر سے چونک سی پڑی اور ایک دم سے میرے خیالات نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچ گئے، میرا دل بیٹھ گیا۔ اور ایسی طبیعت گھبرائی کہ اپنے کمرے میں آ کر مُنہ لپیٹ کر خوب ہی روئی۔ کیونکہ میں سمجھ گئی کہ کس وجہ سے میری نسبت اس جگہ سے چھوٹی ہے۔ اس شریر کا سنجیدہ لہجہ میں اپنے ساتھیوں سے کہنا کہ میں سخت بدلہ لونگا۔ اس طرح میرے اور لڑکوں کے کمروں کا یکجا ہونا اور پھر لڑکوں کی ریاہیں۔ خدا اُن کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد ہی بہت جلد لڑکوں کو نکال دیا گیا، اسی دوران میں ملازمہ نے مجھکو بغیر دریافت کئے یا مخاطب ہوئے گویا سب کچھ ہی بتا دیا۔ واقعہ درصل یوں ہی تہا کہ ساری کارستانی اہی حضرت کی تھی جنکو میں نے بھڑوں سے کٹوایا تہا۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے یہ اُس لڑکے ساتھ کسی اسکول کے

بورڈنگ میں رہ چکے تھے جس کے ساتھ میری نسبت ہوئی تھی وہ ان کے پاس آیا تھا یا انکو کہیں ملا تھا اور اس سے انہوں نے نہ معلوم کیا کیا میرے بارے میں طرح طرح سے کہدیا۔ میری آزادی اور بیباکی اور شرارت کے فرضی قصے اور نہ معلوم کیا کیا۔ قصہ مختصر اس طرح مجھ سے انہوں نے گویا شہر سے کٹانے کا بدلہ لیا۔ اس نے یہاں آکر یا پھر زبانی سب ہی کچھ سُنا ہوگا۔ کیا معلوم میرے نام "کولتار" ہی سے وہ بھڑک گیا ہو۔ قصہ مختصر آخر انسان ہی تہا۔ بہت کچھ والدین نے جب زور لگایا تو اُس نے صاف کہدیا کہ واقعہ درصل یوں ہے اور وہ لڑکی ٹھیک نہیں۔



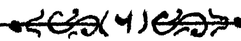
میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ تمام باتیں سُنکر میرا کیا حال ہوا مجھ پر اُس شخص نے خواہ مخواہ کا ظلم کیا۔ اس کا اندازہ وہی آسانی سے لگا سکتی ہے۔ جو غریب ہو اور شریف ہو۔ بیکس و بے مددگار ہو اور دن رات اپنی لڑکی کی شادی کے غم میں رو رو کر اپنی جان کھو رہی ہو یہی حال اماں جان کا۔ روتے روتے انکا بُرا حال ہو گیا جب روتے روتے تھک جاتی تہیں تو ٹھنڈا سانس لیکر کہتی تہیں "خدا کی شان ہے کہ میں نے اپنے کرایہ داروں کو کوئی تکلیف نہ دی اور انہوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا شاید میرا گھر اسی دن کے لئے اُجڑا تہا، یہ کہکر پھر وہ اس بُری طرح روتی تہیں کہ گھٹ گھٹ کر اپنی جان تباہ کر ڈالتی تہیں۔ میرا یہ حال تھا کہ مارے شرم کے اماں جان سے آنکھ نہ ملائی جاتی تہی۔ حالانکہ وہ جانتی تہیں کہ جو الزام بھی میرے اوپر لگائے گئے ہیں وہ سراسر جہوٹ اور غلط ہیں۔ اور میں بالکل معصوم ہوں مگر پھر بھی مُجھے بیحد شرم آتی تہی۔ مجھے اور انہیں اب دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب میری شادی کہیں نہ ہو سکے گی۔ مجھے ویسے ہی اپنی شادی کی ذرہ برابر پرواہ نہ تھی مگر یہ دیکھکر میرا دل کٹا جاتا تھا کہ اماں جان اپنے تئیں اس غم میں ہلاک کئے ڈالتی ہیں، بہت جلد ہی گھر دق کا نمونہ بن گیا اُدہر وہ دن رات روتی تہیں اِدہر میں انکی حالت زار دیکھ دیکھکر

روتی تھی۔ دو دو وقت کھانا نہ پکتا تھا۔ اماں جان سے ملازمہ پوچھتی کہ کیا پکاؤں تو وہ کہدیتیں کہ مجھے بھوک نہیں۔ اور یہی میں کہدیتی۔ غرض گھر کیا ماتم کدہ اور مستقل طور پر ماتم کدہ ہو رہا تھا اور پھر مصیبت یہ مصیبت کہ کوئی صورت بہتری کی بھی نظر نہ آتی تھی۔

میری سہیلی یا ملنے والی بھی کوئی نہ تھی سوائے ایک رآپڈ کے، یہی میری رازدار اور تنہا غمخوار تھی مگر بدقسمتی سے وہ بھی دوسرے شہر میں کوسوں دور ہیں۔ اُسکو عرصہ سے کوئی خط نہ لکھا تھا۔ اس کا ایک خط آیا تھا جسمیں اُس نے میری شادی کا کچھ تذکرہ کیا تھا اور کچھ اپنی شادی کا بھی ذکر کیا تھا اس کے جواب میں میں نے اُسکو ایک درد بھرا طول وطویل خط لکھا۔ اس خط میں میں نے شروع سے آخر تک لڑکوں کی شرارت کا قصہ تفصیل کے ساتھ لکھا تھا اور پھر اپنی مصیبت کا رونا رویا تھا۔ کہ کس طرح ہمارے شریر کرایہ دار نے ہمارے اوپر مصیبت کا پہاڑ توڑا ہے اور کس طرح ہم دونوں ماں بیٹیوں کو دوزخ میں ڈالا ہے، اس پریشانی کی تفصیل کیا تھی گویا میرے ماتم کدہ یعنی گھر اور میرے غمکدہ یعنی دل کے حالات کا آئینہ تھی۔ یہ خط میں نے رو رو کر لکھا تھا اور لکھدیا تھا کہ بہن آنسو پونچھتی جاتی ہوں اور لکھتی جاتی ہوں۔

اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اماں جان نے رو رو کر اپنے کو بیمار ڈال لیا۔ وہ صاحب فراش تھیں نہ وہ کھاتی تھیں اور نہ پیتی تھیں، انکو حرارت ہو گئی اور سوکھ کر کانٹا ہو گئیں۔ انکی پریشانی اور مصیبت میں انکی بیماری نے یہ حال کر دیا تھا کہ جو دیکھتا وہ یہی کہتا کہ انہیں دق ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ بخار زیادہ رہنے لگا اور طبیعت خراب ہی ہوتی چلی گئی جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو سب نے یہی کہا کہ دہلی جائیں۔ وہ تو کسی طرح بھی نہ جاتیں لیکن

میرے رونے پیٹنے سے وہ راضی ہوگئیں اور اپنے ایک رشتہ کے بھائی کو لیکر دہلی پہونچیں۔ کچھ عرصہ تک وہاں علاج ہوتا رہا۔ مگر کوئی افاقہ نہوا۔ بلکہ حالت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی میں گویا اب اماں جان کو قبر میں پیر لٹکائے دیکھ رہی تھی اور پھر یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے بعد ہی بہت جلد میرا نمبر آئیگا۔ ادہر وہ روتی تہیں اور ادہر میں۔ اب سب شرم وحیا اُٹھ گئی تھی اور میں کہتی تھی کہ آپ خواہ مخواہ میری وجہ سے کیوں غم کہاتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ بیکار تہا۔ رہ رہ کر وہ اُنہیں حضرت کو دعائیں دیتی تہیں جنہوں نے میری لگی لگائی شادی چھڑائی تہی۔ وہ بار بار کہتی تہیں کہ یا اللہ میں نے تو کبھی اس لڑکے کو دیکہا تک نہیں۔ نام تک نہیں جانتی تکلیف دینا تو ایک دور کی بات ہے۔ پھر آخر یہ مجھ سے اُسکو کیوں دشمنی ہوگئی۔ پھر خود ہی سر پکڑ کر بیٹھ جائیں اور کہتیں کہ یہ سب کچھ تقدیر کا لوشتہ ہے۔ یہ کہتے کہتے انکی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا امنڈ آتا۔



بہت جلد دہلی کے علاج سے جی اُکتا گیا اور واپسی ہوئی۔ ریل میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی، ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رُکی کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بی بی سے جو ہماری ہم سفر تہیں وہی حضرت کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، یہ بی بی ٹونڈلہ کے اسٹیشن سے ہمارے ساتھ بیٹھی تہیں، اماں جان تو ان حضرت کو پہچانتی نہ تہیں۔ لیکن نام مجھکو بھی معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ میرا اُنکی صورت دیکھکر کیا حال ہوا ہوگا خصوصاً جبکہ وہ بھی سامنے کھڑے ہوں اور مردہ سے بدتر ماں بھی سامنے ہو۔ نفرت اور ایسی نفرت کے جذبات میرے سینہ میں جوش زن تھے جو کسی جانی دشمن کے خلاف ہی ہوسکتے ہیں۔ اور اسمیں شک نہیں کہ جانی دشمن ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں تہا۔ گاڑی چلی تو اُن بی بی سے معلوم ہوا کہ اُن کا بھتیجہ ہے لکھنو کسی کام سے جا رہا ہے، بھتیجہ سنکر آیا ہے۔ ایف اے۔ میں پاس ہوا ہے وغیرہ وغیرہ اِس وقت محض اتفاقیہ مل گیا

ہے ورنہ وہ اپنے مُلازم کے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔
دوسرے اسٹیشن پر پھر وہ اپنی چچی سے باتیں کرنے لگے۔
چلتے وقت میں نے دہلی سے زاہدہ کو خط لکھا تھا۔ ارادہ تھا کہ ڈاک میں ڈلوادونگی۔ مگر سفر کی جلدی میں دہلی میں ڈلوا نہ سکی۔ اور رہ گیا اب اسوقت اتفاقاً یاد آیا اور وہ ہی جب گاڑی کے سامنے ہی اسٹیشن پر لیٹر بکس نظر پڑا۔ جلدی سے میں نے اپنے سیاہ رنگ کے سوٹ کیس نما ٹرنک کو کھولا اور اس میں سے لفافہ نکالا۔ ابھی بند نہ کیا تھا کھولکر جلدی سے حاشیہ پر اتنا اور لکھدیا کہ "یہ خط ریل میں سے ڈلوا رہی ہوں اور اتفاق تو دیکھو کہ میرا اور اماں جان کا قاتل بھی سامنے کھڑا اپنی چچی سے باتیں کر رہا ہے جو ہماری ہم سفر ہیں چونکہ مجھکو اسکی کمینہ صورت ہی سے نفرت ہے مجھے اختلاج سا ہو رہا ہے ورنہ کچھ اور لکھتی"!!
اس خط میں میں نے ان حضرت کے لئے لفظ قاتل پیشتر ہی استعمال کیا تھا اور اپنی اماں جان کی پریشانی کا مفصّل حال لکھا تھا کہ اب واپس جا رہی ہوں۔ زاہدہ جانتی ہی تھی کہ یہ قاتل کون ہے۔ اماں جان سے میں نے کچھ نہ کہا کہ ان بیوی کے بھتیجے صاحب جو سامنے کھڑے ہیں یہی ہماری تمام مصیبت کا باعث ہوئے ہیں۔
خط بند کر کے میں نے ماموں کو دیدیا اور اُنھوں نے سامنے لیٹر بکس میں ڈالدیا ریل نے سیٹی دی اور ماموں خط ڈالکر تیزی سے اپنے ڈبہ کی طرف چلے گئے ریل چلنے کو ہی تھی کہ ان بیوی نے بھی ایک کارڈ جلدی سے اپنے بھتیجے کو دیکر کہا کہ اسکو لیٹر بکس میں ڈالدو۔ میں نے دیکھا کہ ادھر وہ خط ڈالنے لیٹر بکس کے پاس پہونچے اور اُدھر گاڑی چلدی۔ یہ بی بی کہنے لگیں کہ خوب تم نے اپنا خط ڈلوا کر مجھے یاد دلایا ورنہ میرا کارڈ رہ ہی گیا تھا جو بہت ضروری تھا۔

میں نے ان حضرت کو لکھنؤ کے اسٹیشن تک دیکھا برابر وہ ہر اسٹیشن پر ایی چی سے باتیں
کرتے آتے رہے۔ مجھکو اس کی صورت سے نفرت تھی۔
کانپور کے اسٹیشن پر ہمیں اسٹیشن بدلنا پڑا تھا۔ گھر پہنچکر میں نے اپنا سیاہ رنگ کا سوٹ
کیس نما ٹرنک جو کھولا تو سخت چکرائی۔ وہاں بجائے میرے سامان کے۔ صابون۔ کالر۔ ٹائیاں
حجامت بنانے کا سامان دو مردانہ قمیصیں اور ایک سوٹ علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی
مردانہ چیزوں کے اوپر نیچے چاروں طرف غور سے دیکھے یہ معلوم ہوا بالکل میرا ہی سا کسی دوسرے
کا بکس ہے۔ کس سے بدل گیا اس کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ میں بیحد پریشان ہوئی اور میرے
حواس جاتے رہے خاص طور پر اس وجہ سے کہ میری اس میں ایک تصویر تھی اور پھر مجھکو اپنے ان
خطوں کا خیال تھا جو رآبدہ کے پاس سے آئے تھے اور پھر سب سے زیادہ اُس خط کا جو میں نے
سب سے پہلے رآبدہ کو لکھا تھا اور جس کا ذکر کر آئی ہوں کہ روتی جاتی تھی لکھتی جاتی تھی اُس خط کی
ایک نقل اسی صندوق میں تھی۔ مجھکو بڑا اُترا معلوم ہو رہا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ جس کسی ہاتھ میرا
صندوق پڑے گا وہ تمام میری راز کی باتیں مع پتے وغیرہ کے جان جائیگا۔ کیونکہ رآبدہ کے
تمام خط بھی اسی میں مع لفافوں کے رکھے تھے جن پر میرے گھر کا پتہ درج تھا۔ میں پریشان
ہوکر رونے لگی۔ مگر بھلا اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ اماں جان بھی مجبور تھیں۔ ماموں بھی
جا چکے تھے۔ صبر کیا۔

(۷)

بکس کا کھویا جانا تھوڑے ہی دن میں پرانا قصہ ہوگیا نہ معلوم کس کا تھا کہ میرا پتہ معلوم
ہوتے ہوئے بھی اپنا ٹرنک لیے اور میرا واپس کرنے نہ آیا
اماں جان کی حالت بدستور تھی بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ ماموں نے ڈاکٹروں کو دکھایا'

اُنھوں نے یہ رائے قایم کی کہ خیر سے کہانسی نہیں ہے۔ ورنہ جان کی خیر نہ تھی۔ پھر بھی دق ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ لہذا پہاڑ لیجاؤ۔ بڑی مشکل سے اماں جان نہ معلوم کس طرح راضی ہوئیں لیکن واقعہ ہے کہ مجھکو ان کی جان بچنے کی قطعی امید نہ تھی۔

پہاڑ جیسا خوشگوار مقام بھی ہمکو خوش نہ کر سکا سچ ہے جب دلکو چین نہیں ہوتا تو دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں معلوم ہوتی اماں جان مہینہ بھر بعد ہی بالکل گھبرا گئیں میں روکے ہوئے تھی ورنہ وہ کب کی واپس ہو چکی ہوتیں مگر دل اچاٹ ہو گیا تھا اور طبیعت خراب تھی میں جانتی تھی کہ بس کسی روز ایکدم سے اسباب بندھنے لگے گا۔ غرض واپسی کا دن رات ذکر کرتی تھیں۔

اسی دوران میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس نے تمام واقعات کی حالت ہی بدل دی بہت مختصر طور پر بیان کرتی ہوں۔ میری شادی کی نہ تو اب انکو ہی کچھ امید تھی اور نہ مجھکو ایک روز کا ذکر ہے کہ ماموں ایک تار لائے۔ میں کھانا پکا رہی تھی میں نے تار دیکھا اور وہیں سے پکانا چھوڑ کر دوڑی کہ الہی یہ کیا معاملہ ہے "کیسا تار ہے ؟" میں نے دوڑ کر اماں جان سے پوچھا۔ ایک عجیب لہجہ میں اماں جان نے کہا "ہے تم کھانا دیکھو۔ جاؤ۔ جاؤ" میں نے ایک نظر اماں جان کو دیکھا پھر ماموں کو کچھ عجیب سُست سا ہوا اور سر میں درد ہو کر چلی آئی نہ معلوم کیا بات ہوئیں اماں جان خوش معلوم ہوتی تھیں۔ جلدی سے تار کا جواب تار میں دیا گیا میں چکر میں تھی کہ الہی یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا کہیں مگر تو نہ کروں ایسا خیال بھی نہ آسکتا تھا مگر اماں جان کا چہرہ اسقدر بشاش تھا کہ مجھکو کچھ یقین سا ہو گیا اور مارے شرم کے میری ہمت نہ پڑی کہ اُن سے کچھ دریافت کروں کئی تار دیئے گئے اور دوسرے روز بھی کئی تار آئے اور گئے دوسرے ہی روز سب معاملہ معلوم ہو گیا مارے خوشی کے اماں جان مجھ سے لپٹ گئیں اور اس زور سے مجھے دبایا کہ میں گھبرا گئی۔ انکی آنکھیں تر تھیں اور میری بھی یہی حالت تھی "یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ یا اللہ ساتھ خیر و خوبی کے انجام پائے"۔

اماں جان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور مجھکو معلوم ہو گیا کہ میری شادی طے ہو گئی۔ اسباب بندھنے لگا۔ لیکن یہ کہ کس سے طے ہوئی۔ لڑکے کا نام کیا ہے کیا کرتا ہے تو یہ سب باتیں خود اماں جان کو بھی معلوم نہ تھیں، مجھے کیا معلوم ہوتیں۔ بس جو کچھ معلوم تھا وہ یہ کہ بریلی والے چچا کی معرفت شادی طے ہوئی ہے لہذا لازمی ہے کہ مناسب جگہ ہو گی۔ اب میں اماں جان کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی کہ الٰہی یہ کیا ماجرہ ہے کہ دو تین ہی تار آنے جانے سے انکی طبیعت کی مردنی جاتی رہی۔ بجائے گھر کے ایک دم سے اماں جان مجھکو بریلی لیکر پہونچیں۔ وہاں پہونچکر ابھی چچا زاد بہن سے مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جس کے ساتھ میری شادی ہو رہی ہے اُس کا نام کیا ہے اور کیا کرتا ہے۔ کس کا لڑکا ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے اور بس۔ اس سے زاید کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ آخر شادی ایک دم سے کیسے طے ہو گئی میری شادی بجائے گھر سے ہونے کے یہاں سے ہونا طے قرار پائی۔ یہ چچا میرے والد صاحب مرحوم کے چچا زاد بھائی تھے اور بریلی میں وکالت کرتے تھے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس ہفتہ میں شادی ہو جائیگی۔ اماں جان کا بس نہ تھا کہ فوراً ہی ہو جائے انکو دراصل ہر دم یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ گڑبڑ ہو کر چھوٹ نہ جائے۔ اسیوجہ سے یہ تجویز تھی کہ مجھے یہیں سے رُخصت کر دیا جائے۔ میرے جہیز کا بھی کچھ انتظام نہ کرنا تھا وجہ اسکی یہ تھی کہ بجائے رسمی جہیز کے تمام مکانات و دو کانات معہ سارے گھر کے سامان کے حتیٰ کہ چھوٹے کپڑے اور جھاڑو سے لیکر مسہری اور لوہے کی الماری تک مع کُل سامان سب میرے جہیز میں شامل تھا۔ پھر بھی دوسرا سامان اور ضروری جہیز یعنی لوازماتِ شادی جو عرصہ سے گھر پر تیار رکھی تھیں ماموں نے آتے لیکن اماں جان کہتی تھیں کہ بس ایک ٹرنک اور ایک بستر تو گھر بھر میں میرا ہے باقی کُل میری لڑکی کا جہیز ہے، بہت جلد تمام مکانات اور دوکانات اور گھر کے سامان کی بڑی سی فہرست تیار کی گئی اور یہی فہرست مجھکو جہیز کے طور پر دیے جانا قرار پائی جس میں ہر چیز کی تفصیل موجود تھی۔

ایماں کی بات یہ ہے کہ اگر کسی کو موت سے بچنے کی خوشی ہو سکتی ہے تو مجھکو بھی ایسی شادی کی خوشی تھی۔

مجھے کوئی نئی بات معلوم ہی نہ ہو سکی کیونکہ گھر میں سوائے میری چچا زاد بہن کے اور کوئی ہم عمر لڑکی ہی نہ تھی۔ اور یہ بہن بھی عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ بہت مختصر بارات شُسے میں آئی مگر خدا معلوم کہاں کی عورتیں گھر میں پھٹ پڑیں۔ گانا بجانا اور اس پر غُل غپاڑہ، قصہ مختصر آنے کے چوتھے روز میرا نکاح ہو گیا۔ اور اسی روز میں رُخصت ہو کر دولہا والوں کے ہاں پہونچی۔

رات کا وقت تھا اور مجھکو چھت پر لا کر بٹھایا گیا۔ میں کپڑوں میں لپٹی لپٹائی بیٹھی تھی حالانکہ موسم میں قدرے خُنکی آ چکی تھی مگر مجھے گرمی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کہاں تھی چاروں طرف سے عورتوں کا نرغہ تھا۔ مگر عورتیں زیادہ نہ تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو میری حالت عجیب رہی کیونکہ عورتیں میرا مُنہ کھول کھول کر دیکھتی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس جلدی جلدی میں میری شادی تمام فضول رسموں سے پاک رہی اور یہاں آ کر تو مجھکو کسی رسم سے بھی پالا نہ پڑا جب ذرا ہاہا ہو ٹونگ کم ہوئی تو عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں تھوڑی ہی دیر بعد سناٹا چھا گیا اور سوائے گھر کی ایک مُلازمہ کے اور کوئی نہ رہا۔ میں نے اطمینان سے زاید چادر علیحدہ کی اور مُنہ کھولا میں ایک کمرے میں تھی۔ سامنے کمرے کے دروازے کُھلے ہوئے تھے۔ اور ایک باغ نظر آ رہا تھا نہایت ہی خوشگوار ہوا آ رہی تھی ایسی کہ میں نے بہت جلد بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ مُلازمہ نے ٹھنڈا پانی پلایا اور میری جان میں ایک تازگی سی آئی، میں ایک مسہری پر بیٹھی ہوئی تھی اور تھکن کی وجہ سے سرہانے تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ ملازمہ مجھ سے نہ معلوم کہاں کہاں کی فضول باتیں کر رہی تھی جو میں سُن بھی نہ رہی تھی۔ کھانا آیا تو میں نے جوں کا توں ایس

کر دیا۔ اس کے بعد پھر اطمینان سے تکیہ کا سہارا لیکر بیٹھ گئی میری نظر باغ کی طرف تھی مگر خیالات نہ معلوم کہاں تھے، مجھکو اسوقت ایک عجیب خوشی تھی نہ اس وجہ سے کہ میری شادی ہو گئی بلکہ بار بار تمام گذشتہ واقعاتِ زندگی جو تلخی سے بھرے ہوئے تھے، ایک ایک کرکے سامنے آرہے تھے، اور پھر آخر میں نتیجہ یہ کہ میں یہاں بیٹھی ہوئی ہوں جس کا مجھکو یا اماں جان کو وہم و گمان بھی نہ تھا، کہاں تو موت سامنے تھی اور کہاں حالت یکسر خدا نے بدل دی۔ میں خدا کی عنایت اور مہربانی پر غور کر رہی تھی کہ کس طرح میری شادی میں جگہ طے ہوئی اور کس طرح چھوٹ گئی اور پھر ہونا تھی تو یوں ہوئی۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان خیالات کی اُدھیڑبُن میں ان حضرت کا جب خیال آتا تھا تو میرا کیا حال ہوتا تھا۔ نصرت کے خدمات کامیابی کی خوشی میں ملکر عجیب ہی کیفیت پیدا کرتے تھے۔ شکر کرتی تھی کہ خدا نے اس شریر کو ناکام اور مجھکو کامیاب کیا۔

میں انہی خیالات میں مستغرق تھی کہ اُونگھ گئی طرح طرح کے خواب میں نے بہت قلیل عرصہ میں دیکھ ڈالے کبھی اپنے آپ کو گھر پر دیکھا۔ کبھی دیکھا کہ سوراخ میں سے اس شریر کو دیکھ رہی ہوں۔ کبھی اسٹیشن پر خط ڈالنے کا سین پیشِ نظر تھا۔ رہ رہ کر میں یہی دیکھتی تھی کہ کس طرح مجھکو خدا نے تمام مصیبتوں سے چھڑایا۔ ایک ایک مصیبت سامنے آتی تھی۔ اور ہر سین کے بعد اس شریر کے خلاف نفرت بڑھتی تھی جس نے میری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر ہی نہ اٹھا رکھی تھی۔
اسی نیند میں دیکھتے دیکھتے کیا دیکھتی ہوں کہ وہی شریر سیاہ دھاری دار سوٹ پہنے کھڑا ہے جیسا کہ آخری مرتبہ میں نے اسٹیشن پر اپنی چچی سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ایک شرارت آمیز شیطنت کی مسکراہٹ عیاں۔ تیز اور شریر آنکھیں جیسے کہ شرارت کا کوئی پہلو ڈھونڈ رہی ہیں۔ یہ میں نے ایک فاصلہ ہی سے دیکھا اور انتہائی منافرت کے ساتھ دل ہی دل میں کہا کہ تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

ایک دم سے کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے یہ الفاظ اس شریر نے سُن لیئے۔ حالانکہ میں نے یہ الفاظ دل ہی میں کہے تھے اور مجھکو بُری طرح گھور کر کہا "کولتار" کیا کہا؟ کیا میں کچھ نہیں کر سکتا؟"

"تم کچھ نہیں کر سکتے!" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں انتہائی غصہ اور نفرت سے کہا "تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ٹھہر تو جا۔ کولتار" اس نے سخت شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔ چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی شرارت دماغ میں ہے۔ اور میرا یہ حال تھا کہ حالانکہ یہ سب خواب کے واقعات تھے، لیکن اس قابلِ نفرت شکل کو دیکھ کر مارے غصہ کے کانپ رہی تھی۔

اتنے میں ملازمہ نے مار ویکر ہلا دیا اور نہ معلوم جھٹکے سے کیا کہا۔ میں چونک سی پڑی لیکن سمجھ گئی اور جھٹ سے پھر اسی طرح اوڑھ لپیٹ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بڑی دیر تک میں اسی طرح بیٹھی رہی کہ پھر میرے دماغ میں وہی خیالات ہجوم کر آئے۔ پھر وہی قابلِ نفرت شکل گویا میرے سامنے تھی۔ رہ رہ کر مجھے اس شخص کی خیالی صورت دیکھ دیکھ کر نفرت آ رہی تھی۔ ہر چیز اس کی قابلِ نفرت معلوم ہوتی تھی۔ کیا اس بے مُری اور اماں جان کی جان لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھا تھا؟ جب یہ خیال کرتی تھی خون کھولنے لگتا تھا۔

میں اسی خیال میں تھی کہ کسی کے آنے کی کمرہ میں آہٹ ہوئی میں گویا اچھل پڑی اور پھر دل دھڑکنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ آنے والا کون ہے۔

میں نے کسی کے اپنے قریب آنے کی آہٹ سُنی! میرا دل بانسوں اوچھل رہا تھا اور ایک ناقابلِ بیان پریشانی کہ اتنے میں آنے والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کہا۔ کان کے پاس

مُنہ کر کے کہا "کولتار صاحب، السلام علیکم"
میرے اوپر گویا بجلی گری اور میں چونک پڑی، غنیمت ہوا کہ چیخی نہیں تن بدن میں رعشہ تھا اور بدن میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ جس شخص کا خیال میرے دل میں تھا جسکو عالمِ خواب میں ابھی ابھی دیکھا تھا اور جس کے خلاف انتہائی نفرت کے جذبات میرے سینہ میں ابھی ابھی موجزن تھے کیا یہ وہی نہیں ہے!! یہ لہجہ۔ یہ شرارت آمیز لہجہ میرے لئے نیا نہ تھا۔ میں خوب جانتی تھی۔
"کیا یہ وہی شخص نہیں جس نے میری اور اماں جان کی زندگی تلخ کر دی تھی . . . . . یا اللہ اس سے تو انتہائی نفرت تھی . . . مگر اب! . . . . . . !"
چشم زدن میں مُندرجہ بالا خیالات میرے دماغ میں آئے اور گئے اور قبل اس کے کہ میں اس انقلابِ عظیم پر غور کروں پھر اُسی عزیز ترین شخص نے کہا "اجی کولتار صاحب . . . مزاج شریف . وہ کھڑوں کا چھتہ . . . . میرے تمام منہ پر لپٹ گئی تھیں . . . . جناب کولتار صاحب . قبلہ اجی کرا نہ لیجائیے . "
غرض بہت کچھ کہہ ہاکہ کر کے مجھے ہلا یا جُلا یا مگر بیاں جواب نہ دارد۔

ماث۳

اِنقلابؔ

شادی اگر ہر لڑکی کے لئے ایک انقلاب ہے تو پھر میرے لئے؟ شاید ایک حیرتناک استعجاب! وہ شخص جو میرے خیال میں میرا جانی دشمن تھا۔ دنیا میں جس سے مجھے سب سے زیادہ نفرت تھی یا ہوسکتی تھی وہی اور وہی شخص چشم زدن میں میرے لئے عزیزترین شخص تھا۔ عقل نہیں کام کرتی کس طرح انتہائی نفرت معدوم ہوگئی جس کا خیال ہی اپنے ضمیر کو قابلِ نفرین معلوم ہوتا ہے! کیونکر تھی؟ یہی معمہ معلوم ہوتا ہے۔

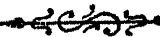
(۱)

مولنا!! الٰہی خیر! سسرال کے اسٹیشن پر پہونچتے ہی یہ لفظ پہلی مرتبہ عمر میں اس طرح میں نے سُنا کہ دنگ رہ گئی۔ وہ بھی ایک قلی کے مُنہ سے!

اسٹیشن سے گھر تک موٹر میں یہی سوچتی رہی کہ واقعی کیا میں "مُلانی" ہوں!

واللہ اعلم۔ دل میں میں نے کہا "خاندانی مولانا ہوں گے۔ مولویوں کے گھرانے کے!" میں اپنے کمرہ میں اُتری۔ چاروں طرف دیکھا۔ شاید میری آمد کے سلسلہ میں کمرہ ضرورت سے زیادہ آراستہ پیراستہ تھا۔ ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ طالعلم کا کمرہ ہے۔ میں دیکھ ہی رہی تھی اِدھر اُدھر کہ آپہونچے۔ "کولتار صاحب" مسکراکراُن عجیب و

غریب مولسنا نے چپکے سے میرے کان میں ستانہ ہلاکر کہا۔
میں نے سر اٹھاکر آنکھوں میں آنکھیں اچھی طرح ملاکر شاید پہلی مرتبہ دیکھا۔ کچھ عجیب معلوم ہوا میں نے گردن نیچی کرلی کہ پھر کہا "کولتار صاحب" وہی لفظ "کولتار" جو تن بدن میں آگ ایسی لگادیتا تھا۔ اُسی لفظ کولتار نے اور پھر اُسی زبان سے اسوقت میری روح کو ستابد فرحت سے لبریز کردیا۔ بمصداق ع
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
پہلی مرتبہ میں نے بھی تڑکی بہ تڑکی جواب دیا "مولسنا صاحب" اس نے جس طرح سن پڑا کہا
"یہ کچھ نہیں" مولسنا نے کہا۔
"وہ بھی کچھ نہیں" میں نے جواب دیا مگر مولسنا کا کہا صحیح تھا کیونکہ مجھے بعد میں بہت جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ہر وہ شخص جو سوٹ پر سلیم شاہی یا اچکن پر ہیٹ لگائے پاکتا میں لعل میں دیا کر کالج کی طرف مُنہ کرے آدمی بعد میں اور مولسنا پہلے ہے خواہ اس کے ڈاڑھی ہو یا ہر چہار ابرو کا صفایا کرتا ہو۔ اس سے کچھ بحث نہیں۔



میری شادی میرے لئے ایک معمہ تو تھی ہی لیکن اب وہ معمہ حل ہی ہوچکا تھا دہلی سے گھر آنے میں ریل پر میرا ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس مُعاٹرنک بدل گیا تھا۔ وہ اب ملاکمرے کے ایک کونہ کی طرف مولسنا نے انگلی اُٹھائی میں نے دیکھا۔ کھولا جو بھی تو ایسی تمام چیزیں جوں کی توں موجود پائیں ہاں تصویر ندارد تھی جو البم میں ملی۔ مولسنا کی امانت یعنی اُس کے کپڑے وغیرہ لکھنو میں کسی صندوق کے کونے میں پڑے چھوڑ آئی تھی۔ پھر ساتھ ہی وہ خط بھی ملا جو میں نے اپنی سہیلی زاہدہ کو ماموں سے ریل میں سے ڈلوایا تھا اور جس کے

حاشیہ پر لکھا تھا کہ میرا قاتل میرے سامنے کھڑا ہے۔ اب عقل نہیں کام کرتی کہ زاہدہ کو خط لکھوں تو کیونکر اور کیا کہیگی کہ میرے منگیتر کو چھین لیا۔ میں نے اس خط کو مولنا سے جھپٹ کر پھاڑ ڈالا۔

(۲)

تیسرے ہی روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مولنا کالج گئے تھے اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں برابر والے کمرہ سے کچھ دلچسپ باتوں کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ ہی میں سے چپکے سے جھانک کے دیکھا۔ ایک بڑی بی نہایت ہی راز دارانہ لہجہ میں باجی اماں (میری خوشدامن صاحبہ) سے باتیں کر رہی تھیں۔

دلہن کو جب بیاہ کے آتی ہے تو سسرال سے اچھا سا خطاب ملتا ہے۔ بہن وہ غریب ہوں تو کیا مگر دلہن کو بیگماتی خطاب دیتے ہیں۔ مگر بہن تمہارے یہاں کی ریت نرالی ہے! دولہن بیاہ کر آئی ہے تو اسے "نگوڑا" "تارکول" کا خطاب دیا! نا بابا یہ باتیں تو ہم نے کبھی۔ سنیں نہ دیکھیں!" (بڑی بی نے آخری حملہ کانوں پر ہاتھ رکھکر اپنے جھریوں دار چہرہ پر زلزلہ ڈال کر کہا)۔

"مجھے تو یہ خیال ہو کہ" باجی اماں خطرہ اور اندیشہ کے لہجہ میں بولیں کہ "دنیا کیا کہے گی!"

اس کے جواب میں بڑی بی نے اپنے منہ کو گول گول کر کے صفر بنایا اور پھر اس صفر کو بڑی تیزی سے ایک سطر کی شکل میں عجیب وغریب طریقہ سے تحلیل کر دیا۔ باجی اماں نے اس حیرت انگیز اظہار خیال کو غور سے نوٹ کیا اور پھر بولیں "کہو تو یہ ڈر ہیں کہ باپ سنے گا تو کیا کہے گا۔ اور سُسر ہی لیا ہے ..."

بات کاٹ کر بڑی بی تیزی سے پان کھاتے میں اپنی ٹھوڑی سے ناک کی پھننگ چھو کر

سر مٹکا کر بولیں۔

"باپ سُن لیگا تو نکال دے گا ... لکھ رکھو بہن جو نکال نہ دے تو میرا نام پلٹ کر رکھدینا وہ ایسے ہیں ہی ... ہیں ہی وہ ایسے ہی" یہ کہکر بڑی بی نے آنکھیں نکالکر ٹھوڑی سے اپنی ناک پھر تیزی سے چھوکر چارپائی ہی پر اس طرح پینترا بدلا کہ جیسے یہ خود ہی نکال دینگی۔

"یہی تو میں کہتی ہوں" باجی اماں بڑی بی کے پینترے پر فدا ہو کر بولیں۔"یہی تو میں کہتی ہوں۔ نہ اُسے میری پرواہ اور نہ اُسے دادی کا خیال اور نہ اُسے یہ خیال کہ بوا کل کو ساس سُنے گی تو کیا ہوگا" باجی اماں کچھ واقعی بےچین ہو کر بولیں۔"بھلا میں کیا مُنہ دکھاؤنگی۔ جب وہ کہیں گی کہ" واہ بہن سمدھن! خوب میری اکلوتی بیٹی کی قدر کی ہے"۔ وہ عادت کی اچھی نیک ہے، غریب طبیعت کی ہے تو کیا بہن وہ ماں سے یہ بھی نہ کہیگی کہ مجھے کولتار کا خطاب سسرال سے ملا ہے!"

سر ہلا کر بڑی بی بولیں۔" دلہیں کیا کہتی ہوگی!... " پھر کچھ آنکھیں جھپکائیں، چہرے کی کچھ کان نکالی اور بھنویں سکیڑ کر گویا معمّہ حل کرنے بیٹھیں بولیں۔"تو بوا یہ آخر بات کیا ہے؟ یہ "تارکول" کیوں کہتا ہے؟ . کیوں کہتا ہے؟" یہ کہکر پھر ایک بیا پینترا بدلا اور گویا بات کی تہ کو پہونچ گئیں۔"کیا جورو پسند نہیں کرتا؟" کچھ رازدارانہ لہجہ میں بڑی بی نے یہ بات کہی۔

"پسند نہیں کرتا!" باجی اماں نے گویا چیں بہ جبیں ہو کر کہا "لو اور سُنو! بوا! تمہیں نہیں معلوم! اے لو! میں نے تو اسکی بات بڑی جگہ بھیجی تھی۔ بات چیت طے ہو چکی تھی، مگر کہاوں میں جاتے جاتے لوٹ آیا۔ پھر اسی بڑی بچی کو بیچ میں ڈلوا کر تین طوفان جوڑے! ایسے کہ بس جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔ باپ نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے۔ اُنھوں نے تو چھوڑ ہی دیا ہے جو چاہو سو

کرو۔ تومطلب یہ ہے کہ بہن خودہی اپنی پسند سے شادی کی اب ماپسندی کا ہیکی!۔۔
۔۔ ریل میں دیکھ لیا تھا" باجی اماں بڑی بی کو ٹھوکا دیکر جھٹکے سے بولیں بڑی بی نے یہ سُنکر اس زور سے آنکھیں پھاڑی ہیں کہ میں تو یہی سمجھی کہ بس اب یہ چلیں۔ گول گول مُنہ انکا چوہے کے بل کی طرح نکل آیا۔ کچھ سنبھلکر بولیں۔" ہیں! اپنی پسند کی جورو! اپنی پسند کی جورو انتخ کرلینے دی!۔۔ ۔ ۔۔" فوراً راستہ چھوڑ کر بولیں۔" مگر بڑی اچھی اور بھولی لڑکی ہے ۔
۔۔ ۔مگر ہاں۔۔۔ ۔ تو اپنی پسند کی جورو لایا تو پھر کیوں ۔۔۔ ؟"
"اُونہہ" باجی اماں بولیں۔" یہ بھی آج کل کے لڑکوں کی ادا ہے کہ جسکو چاہیں چوچلہ میں آکراسی کی گت سنائیں۔ اُلٹے سیدھے نام دھریں۔ یہی بات ہے اور کوئی وجہ نہیں صورت شکل تمنے دیکھی ہی ہے۔ خاصی اچھی۔ گوری چٹی۔۔ چاند کا سا ٹکڑا ہے۔"
باجی اماں کا یہ ریمارک۔ میری تعریف میں۔۔۔۔ مبالغہ آمیز تو خیر تہا ہی مگر اظہار محبت کا شاید بہترین طریقہ تہا۔ ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ چاند تو ریں سے واقعی بہت دُور ہے۔
"بڑی پیاری صورت کی بھولی بھولی بچی ہے" بڑی بی ایک عجیب لہجہ میں گویا روکر بولیں۔
میں ہمہ تن اس مکالمہ کے سُننے میں مشغول تہی کہ آواز آئی "کولتار صاحب"
میں ایک دم سے چونک سی پڑی مولانا کالج سے بے وقت آگئے تھے۔ میں نے مُڑکر دیکھا " یہ لو" کہکر انہوں نے ایک خط میری طرف پھینکا۔
خط میں نے ہاتھ میں لیا لیکن بجائے اسکو دیکھنے کے میں لفظ "کولتار" کے تلفظ کی خوبی پر غور کررہی تہی۔ کتنا پیارا لفظ ہے۔ "کول تار" میں نے دل میں کہا کس طرح یہ

لفظ سنتے ہی دل میں گڑگڑ کر رہ جاتا ہے! کیا تمام دنیا کے پُرسرور اور لطیف نغمے اس لفظ میں مضمر نہیں۔ اگر ستار کے کسی تار کو مضراب سے چھیڑا جائے تو کیا یہی لفظ ایک طاقت ور جھنائے کے ساتھ ہوا میں نہیں تیرتا پھرے گا۔ یا ہارمونیم کے ہر پردہ سے یہی لفظ "کولتار" نہیں نکلتا۔ کبھی غور کیجئے گا۔ ہارمونیم کی آواز کا آخری سانس یعنی ہر پردہ کے ترنّم کی روح در اصل یہی لفظ ہے "کول .تار. ... ررررر"

یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ قصہ سُنئے۔ میں نے خط لیا اور قبل اس کے کہ کچھ کہوں دادی اماں کا دلچسپ چہرہ دروازہ سے ایک کھٹکے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ان کے کندھے کے بائیں جانب باجی اماں کا سر تھا اور اس کے مشرق میں اُن دلچسپ بڑی بی کی متحرک ٹھوڑی جو اس وقت سنگر کی مشین کے "سٹل" کی طرح ناک کی پھننگ کی جانب برابر حرکت کر رہی تھی۔

"یاد رکھیو کہ مارے طمانچوں کے منہ توڑ دوں گی۔" دادی اماں نے مولانا کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اب کی میں یہ سنوں!"

پوتے صاحب اپنی دادی کو بہت پیارے تھے اور شاید اسی وجہ سے ضرورت سے زیادہ گستاخی سے دادی کو بھی تختۂ مشق بنانے سے نہ چوکتے تھے سمجھ گئے کہ دادی اماں نے لفظ "کولتار" سن لیا مگر نہایت ہی سادگی سے پوچھا "کیا سنا؟"

"یہی" دادی اماں نے ہاتھ جھٹک کر کہا "یہی!"

"کیا یہی"؟ مولانا نے دادی اماں سے پوچھا۔ تاکہ وہ خود لفظ کولتار کو دُہرائیں۔

"یہی جو تو کہتا رہتا ہے" دادی اماں نے کچھ سٹپٹا کر کہا۔

"آخر کیا کہتا رہتا ہوں؟ معلوم تو ہو!" مولانا نے زور دیکر پوچھا۔ "معلوم تو ہو۔ کچھ

بتایئے تو سہی"

دادی اماں کی حالت نہ صرف قابل رحم تھی بلکہ ہنسی کے قابل۔ اُنکو کچھ تو جھنجھلاہٹ آئی اور کچھ آئی ہنسی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دم سے حملہ آور ہوئیں ایک دو تین ہاتھ ایسے دیئے کہ وہاں تو کیا چوٹ لگی ہو گی مگر خود اپنا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اور ادھر مولانا نے ان کا پیچھا لیا کہ "آخر کچھ تو بتایئے کہ وہ کونسا لفظ ہے جو نہ کہا کروں" مگر دادی اماں نے نہ بتانا تھا نہ بتایا۔

باجی اماں البتہ بیٹھ گئیں سمجھانے۔ وہ بھی شاید مجھے سُنانے کو اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کو کہنے لگیں "یہ بدتمیزی ہے .... بدتہذیبی ہے .... نام پڑ جائیگا .. ... بہت بُری بات ہے .. .. بڑی شرم کی بات ہے .. جو سُنے گا نام دُھرے گا اور . پھر . .. . نام پڑ جائے گا .. ... غضب ہو جائے گا" وغیرہ وغیرہ۔ دادی اماں نے بجائے لیکچر دینے کے سخت گیری کا انتظام کیا اور کہنے لگیں "اب کی اگر میں نے سُنا تو زباں کاٹ لونگی .... ہونھ .... لو اور سنو .. آیا وہاں سے .. .. بدتمیز .. , کمینہ کہیں کا . . ."

بڑی بی جواب تک خاموشی سے اپنی ٹھوڑی کو تیری سے "اُٹھک بیٹھک" کرا رہی تھیں سر ہلا کر بولیں "نا بیٹا . بُری بات ہے"!

دادی اماں نے چلتے چلتے مجھ سے کہا "اس کی جو یہ کہے تو مجھ سے کہنا" میرا کندھا ہلا کر کہا "مجھ سے کہنا ... ضرور"

میں نے مجبوراً کہا "بہت اچھا"

فطرت شاید میرا ہی خاصہ ہے۔ بہت ممکن ہے۔ جب کوئی نہ رہا تو تن کر میں نے مولانا سے کہا "خبردار جو تم نے مجھے اکی کولتار وولتار کہا ۔ ۔ ۔ ۔ کہدونگی دادی اماں سے! یہ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ سب کے سامنے کہتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کیا فائدہ اس سے؟"

مولانا نے اس اسپرٹ کو شاید پسند کیا۔ بیحد پسند کیا۔ اور ادہر میں نے اور ریاکاری برتی کیونکہ جانتی ہی تھی کہ یہ کہنا ہرگز نہ چھوڑیں گے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کچھ مہمان آگئے اس قسم کے کہ مولانا کمرہ سے نکالے گئے۔

(۳)

آنے والی بیوی مجھے دیکھ بھال کے باجی اماں کی طرف چلی گئیں مگر اپنی بہو کو چھوڑ گئیں اور اُن سے میری ملاقات ہوئی۔ مجھ سے بڑی محبت سے ملیں۔ سانولا رنگ تھا بڑی خوبصورت اور چمکدار آنکھیں تھیں۔ بہت دلکش اور جاذبِ نظر اور نہایت ہی ملیح اور پُر نمک چہرہ تھا۔ مگر صورت پہ کچھ عجیب و غریب اُوداسی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ انداز گفتگو میں درد کی ایک کسک سی تھی۔ بہت صاف اور ستھرا پاکیزہ لباس پہنے ہوئے تھیں مگر ایک نظر سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اپنے اوپر جبر سا کیا ہے۔ غرض کچھ عجیب ہی "دل بجھی" سی تھیں میری ہم عمر تھیں شاید مشکل سے دو چار برس بڑی ہونگی۔ ویسے تو کھل مل کے باتیں کیں مگر جہاں اُن کے میاں کا ذکر آیا اور میں نے حال احوال پوچھا تو کچھ ٹال سی گئیں۔ پہلی ملاقات تھی میں نے بھی کچھ نہ پوچھا کہ اتنے میں باجی اماں اور انکی ساس آگئیں۔ دو ایک باتیں اِدہر اُدہر کی کر کے باجی اماں نے اُنکے میاں کا قصہ چھیڑا اور اُنکی خوشدامن صاحبہ سے حال دریافت کرنے لگیں۔

اُنہوں نے اپنے فرزند ارجمند کے بارہ میں کہا "کیا بتاؤں وہی حال ہے ۔ ۔ ۔ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتا"۔ یہ کہکر خاتون کی طرف دیکھا اور قصداً تیزی سے دوسرا ذکر

چھیڑ دیا۔ باجی اماں بھی شاید سمجھ گئیں کیونکہ بی خاتون بھی غیر متعلق باتوں میں تیزی سے مشغول ہوگئیں۔



کھانے کا وقت آیا تو میں نے اور بی خاتون نے کھانا ساتھ کھایا کھانے پر میری ہمت پڑی اور میں نے اُن سے اُن کے میاں کے بارہ میں پوچھا۔ میرے سوال پر ایک دم سے گم سُم سی ہوگئیں۔ میری طرف ایک عجیب بھولے پن سے دیکھنے لگیں، مجھے ان پر بڑا ترس آیا۔ کہنے لگیں "کیا بتاؤں بہن احدا نہ میرا قصہ کسبکو سنوائے"! جب میں نے ان سے ضرورت سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا تو مختصر الفاظ میں قصہ سُنایا۔

"میاں کو آوارگی سے فرصت نہیں۔ دن رات بدمعاشی میں بسر کرتے ہیں۔ جب بیاہ کر لائے تو دو ایک مہینہ تو کچھ سہاگ رہا پھر اس کے بعد وہ دولت اور وہ گت بنائی کہ خدا کی پناہ۔ بڑے مکان ہی سے ملا ہوا چھوٹا مکان ہے جسمیں اکیلی پڑی گھلتی رہتی ہوں اور یہی تقدیر میں بدا معلوم ہوتا ہے۔ میاں کو گھر میں آنے کی قسم ہے۔ دن اور رات باہر ہی رہتے ہیں اُن کے ملازم علیحدہ ہیں صرف کھانا گھر سے ملتا ہے اور جیب خرچ کو سو روپیہ ماہوار ملتے ہیں جسمیں سے مجھے کوڑی نہیں ملتی۔ ماں کا یہ حال ہے کہ بیٹے کو سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روپیہ چُپکے سے دیتی ہیں، یا پانچ پانچ ہزار کی ڈگریاں چُپکے سے چُکا دیتی ہیں۔ دو ڈہائی سو روپیہ ماہوار رنڈیاں لے جاتی ہیں میری قسمت میں نہ ساس سے لکھا ہے اور نہ میاں سے۔ کبھی کبھار گھر میں آئے بھی کسی کام سے تو تیزی سے نکلے چلے گئے۔ کچھ عرصہ گذرا دس ہزار روپیہ نقد بینک میں میرے نام میرے حصہ کا والد صاحب نے جمع کر دیا تھا وہ بھی لے لیا۔ ۔ "

"ارے!" میں نے کہا۔ "وہ کیسے لے لیا؟"

"کیسے لے لیا!" وہ مسکرا کر بولیں۔ "لے لیا کہ لاؤ"۔

میں نے کہا کہ "بینک کا روپیہ تو تمہارے دستخطوں بغیر نکل ہی نہ سکتا تھا۔ آخر کیسے لے لیا؟"

"مجھ سے دستخط لے لئے بلکہ میں نے خود دیدیئے۔"

"زبردستی دیئے یا خود خوشی سے؟"

ہنس کے بولیں "بہن زبردستی تو نہیں کی، تین مہینہ سے مجھ سے بات چیت نہ کی تھی۔ ایک روز آئے اور مجھ سے کہا دستخط کردو . . . ."

"آپ نے کر دیئے!" میں نے کہا۔

مسکرا کر بولیں۔ "ہاں میں نے کر دیئے۔" والد صاحب اور والدہ صاحبہ آج تک خفا ہیں، اُن سے وعدہ کیا تھا کہ بغیر اُن سے پوچھے کبھی روپیہ نہ نکلواؤنگی۔"

"پھر کیوں دستخط کر دیئے؟" "اپنی خوشی سے کر دیئے۔" مسکرا کر بولیں "کیا منع کر دیتی؟"

"اور کیا" میں نے کہا "بیشک منع کر دینا چاہیئے تھا۔"

"میں منع کر دیتی تو وہ اور خفا ہو جاتے اور یہ مجھے منظور نہیں۔ میں نے اسلئے کر دیئے کہ مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔"

"تو پھر راضی ہوئے بھی یا نہیں؟"

"آج سات مہینہ پورے گذر گئے جب میں نے روپیہ دیا تھا اُس روز سے تو بالکل صورت تک نہیں دکھائی ہے۔ یہ آٹھواں مہینہ ہے جو اندر آئے تھے۔"

"تو کیا بالکل ہی نہیں آتے؟" میں نے پوچھا۔

"قطعی نہیں آتے، دیکھنے میں بھی نہیں آتے" خاتون بی بولیں۔

"پھر . . پھر آپ کیا کرتی ہیں . . ؟"

"کچھ نہیں۔ بس گھر میں دن رات پڑی رہتی ہوں۔ اپنے گھر بھی نہیں جاتی۔"
"جب آپ کو بالکل چھوڑ رکھا ہے تو آخر اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں؟"
"گھر دور ہی کونسا ہے مگر میں تو کہیں نہیں جاتی بس پڑی رہتی ہوں مہینوں اسی طرح پڑے پڑے گذر جاتے ہیں۔ اب دیکھئے گئے ہوتے ہیں آج کل باہر کہیں سیر کرنے کو رنڈی کو لیکر۔ معلوم کہاں گئے ہوئے ہیں اور کب آئیں گے۔"
"کہیں باہر گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"جی ہاں باہر ہی گئے ہیں۔ کسی میلہ میں گئے ہونگے۔ کیا معلوم کہاں کہاں جائیں گے۔"
"تو آپ نے روپیہ کیوں دیدیا؟" میں نے پھر زور دیکر پوچھا۔ "جب جانتی تھیں کہ سب رنڈیوں کو کھلا پلا کر برابر کردیں گے؟"
"اور کیا کرتی" وہ بولیں "مجھ سے مانگا ہی ایسے تھا۔"
"کیسے؟"
ایسے مانگا کہ عرصہ سے اندر ہی نہیں آئے تھے۔ آئے اور بیٹھ گئے۔ مجھ سے بات تک کی نہ کرتے تھے۔ کہنے لگے۔ "ایک بات کہیں تم سے مان جاؤ گی؟" بس میں کیا بتاؤں مجھے کتنی تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا۔ "کوئی بات ایسی بھی ہو سکتی ہے جو آپ کہیں اور میں نہ مانوں آپ شوق سے کہیں۔" اے بہن اتنا کہنا تھا کہ مجھ سے کہا کہ "یہ لو کاغذ اس پر دستخط کردو۔"
میں کاغذ دیکھکر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ سناٹے میں آ گئی اور چپ گردن نیچی کر لی مجھ سے پوچھا "نہیں کرو گی؟" ... "نہیں کرو گی؟" میں نے ایک مرتبہ سر اوپر کرکے دیکھا اور پھر چپ ہو رہی۔ بس اوٹھکر چلنے لگے کہ "مت کرو۔" میں گویا ایک دم سے چونک پڑی اور پریشان ہوکر میں نے کہا "لائیے۔ لائیے کردوں۔"

وہ بولے "رہنے دو مت کرو" یہ کہکر جانے لگے۔

میں نے لپک کر ہاتھ پکڑ لیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ..."

"ارے! ارے!" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ کیونکہ بات کرتے کرتے بی خاتون کی آواز گھٹ گئی اور ایک دم سے اُنھوں نے مُنہ چھُپا لیا! وہ رو رہی تھیں! جلدی سے اُنھوں نے آنسو پونچھ ڈالے۔ کھانا ہو چکا تھا باجی اماں آگئیں اور ان کی خوشدامن صاحبہ بھی آگئیں اور بی خاتون اس طرح باتیں ہنس ہنس کر کر رہی تھیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔



تیسرے پہر کے وقت وہ چلی گئیں۔ مجھ سے آنے کا وعدہ لیا۔ شام کو مولنا سے اور تفصیل معلوم ہوئی۔ اُن کے شوہر پرلے درجہ کے آوارہ اور رنڈی باز ہیں۔ حالانکہ لڑکے شوہر ہیں اور اس پر یہ ستم۔ روپیہ پیسہ کی کمی نہیں۔ اپنی بیٹھک میں بیٹھے رنڈیوں سے تاش کھیلتے رہتے ہیں نہ کسی کی حیا نہ شرم اور بیوی مکڑی کی طرح کونے میں مُنہ دیئے بیٹھی رہتی ہے کسی قسم کا بیوی سے سروکار ہی نہیں بالکل چھوڑ دیا ہے۔

میں نے اس غریب لڑکی کی حالت پر غور کیا۔ خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر ایک شخص کی نالائقی نے اسکی دُنیا تاریک کر رکھی ہے۔ اللہ رحم کرے۔



ہاں وہ خط جو مولنا نے دیا تھا وہ دراصل ایک میلاد شریف کا بُلاوا تھا اور کوئی خاص بات نہ تھی۔



باب (۴)

میلاد شریف

(۱)

ٹھیک پانچ بجے میں میلاد شریف کی محفل میں پہونچی میزبان صاحبہ مسکراتی ہوئی اُٹھیں اور مجھ سے کہا "بیٹی تمہاری ساس نہیں آئیں؟" میں نے کہا "خالہ میں اکیلی ہی آئی ہوں، باجی اماں کی کچھ طبیعت کسلمند تھی، اُنھوں نے کہدیا ہے کہ سر کا درد کم ہوا تو وقت کے وقت میں بھی ہو جاؤنگی۔"

بڑی محبت سے اُنھوں نے لیجا کر مجھے برآمدہ میں بٹھایا بڑی بوڑھیوں کا ایک مجمع کا مجمع تھا۔ میں نے سلام کیا اور بیٹھنے لگی کہ اُنھوں نے کہا "تم اودھر آؤ" یہ کہکر مجھے کمرہ کے دروازہ کے پاس ہی بٹھا دیا۔ کمرہ کی چوکھٹ کے پاس ہی کمرہ میں میری ہمعمر لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری ان میں سے کسی سے ملاقات نہ تھی۔

میں بیٹھی ہی تھی کہ ایک بیوی نے مجھے گھور کے دیکھا۔ برابر والی سے کچھ پوچھا پھر سر ہلا کر میری طرف کچھ غصہ سے دیکھا کہ اتنے میں برابر والی ایک لڑکی نے میرے کان میں نہ معلوم کیا کہا کہ یہ بیوی بولیں "بیٹی۔ اللہ رکھے تم نئی دلہن ہو، تمہارے بھی وہی بڑھ ونگنوں کے سے ڈھنگ ہو گئے۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ نہ ناک میں نتھ نہ کان میں پتے بس ترچھی مانگ

میں افشاں چھڑک کے دولہن بن گئیں"

میں اس بے تکی برجستگی پر کچھ دھک سی ہو گئی۔ مجھے اس اعتراض پر بڑی جھینپ سی معلوم دی اور غصہ بھی آیا۔ لیکن اب انہوں نے سب پر چوٹ کی "سب کی سب! اے لو دیکھا" برابر والی بی بی کو مخاطب کر کے کہا۔ "سب کی سب بیاہی بن بیاہی ڈنڈا سے ہاتھ لئے بیٹھی ہیں۔ یہ آخر ان کے ڈھنگ کیا ہیں!!"

(۲)

ان بی بی کے دو تین ہی چھینٹوں کا یہ اثر ہوا کہ لڑکیاں کمرہ میں اور اندر کو سرکیں اور آہستہ آہستہ سرک کر دور ہو گئیں۔ میں نے تھوڑی ہی دیر بعد مڑ کر دیکھا تو میں اکیلی تھی۔ اس کمرہ سے نکل کر لڑکیاں دوسرے کمرہ میں پہونچی تھیں جس کے دروازہ پر وہی لڑکی کھڑی تھی جو میرے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھکر اس نے مسکرا کر ہاتھ سے بلایا۔ میں خود یہاں تکلّف میں جکڑی بیٹھی تھی ادھر ادھر دیکھ کے نظر بچا کے میں بھی سرک گئی۔

کمرہ میں جو پہونچی تو ایک طرف کیا دیکھتی ہوں کہ مارے ہنسی کے تین چار لڑکیوں کا دم نکلا جا رہا ہے۔ اتنے میں جس طرف سے میں آئی تھی ادھر سے ایک اور صاحبہ آئیں۔ پھر مجھے دیکھے ہوئے یا میری طرف متوجہ ہوئے وہ ایک دم سے ہنسنے والیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں ہنسی کی وجہ دریافت کی گئی تو معلوم ہوا کہ کچھ نہیں صرف یہ امر دریافت ہوا ہے کہ ایک بہن کے منگیتر کے ڈاڑھی ہے لہذا خواہ مخواہ انکو تختۂ مشق بنایا جا رہا تھا اور یہ تمام ہنسی اکا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ بیچاری سے کچھ جواب ہی نہ بن پڑتا تھا کہ یہ لو وارداسی غریب پر یل ہی تو پڑیں۔ ایک دوہتڑ مار کر پیٹھ پر بولیں:۔

"مجھے کیا حسرتی کمبخت کہ تو ڈاڑھیوں پہ جان دیتی ہے! میرے محلہ کا مولوی لنڈورا ہی گھوم

رہا ہے تیرے میاں سے جو گنی لمبی ڈاڑہی ہے۔ مایہ لیجو حب کیجیو۔ اور پھر ۔"
اتنے میں جنہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے بلایا تہا انہوں نے دوڑ کر ان کا منہ بند کیا اور پکڑ کر میرا ان سے تعارف کرایا۔ میں نے غور سے انہیں دیکھا گلابی شلوار ساٹن کی اور اسی رنگ کا خوبصورت گلا کھلا جمپر پہنے تہیں۔ صورت شکل خوب چمکیلی اچھی گوری چٹی چمکدار آنکھیں اور بہت ہی شستہ نقشہ۔ ہنسی میں سر سے پیر تک گویا لسی ہوئی تہیں۔ آنکھوں سے ایک شوخی عیاں تہی اور تندرستی اور خوش دلی نے چہرہ پر وہ نکھار پیدا کیا تہا کہ پان جو کہائے ہوئے تہیں تو معلوم ہوتا تہا کہ چہرہ گویا دھک رہا ہے۔ ان شوخ وطرار بہن کا نام شاہدہ تہا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور تعارف ہوتے ہی انکا چہرہ ایک دم سے شرارت سے دمک اٹھا۔ ہاتھ چھڑا کر بلائیں میری لیکر یہ شریر بولی۔ "ایلو بہن! تم سے ملنے کو تو بندی پھڑک رہی تہی۔ اے تمہیں ہوتا اس "فلیتہ" کی جورو؟ اے تمہیں "کولتار" ہونا۔" میں ہکا بکا رہ گئی کہ لڑکیوں کو مخاطب کر کے وہ بولیں "اری کمبختو۔ اری کمبختو! اس ڈاڑہی والے پہ بھیر وجہاڑو۔ آگ لگے کمبخت جوگی کی ڈاڑھی کو۔ اری انہیں دکھوا نہیں!" یہ کہکر دو تین کو گھسیٹ کے میرے سامنے لا کھڑا کیا اور کہا "کمبختو انہیں دیکھو۔ ان بیچاری کے کرم پھوٹ گئے' وہ دیوانہ فلیتہ انہیں پکڑ لایا اور نہیں کچھ تو ان کا نام اس نے "کولتار" رکھدیا"! اسپر ایک قہقہہ لگا۔ میں کچھ جھینپی سی گھبرائی سی کھڑی مسکرا رہی تہی کہ مجھے شاہدہ نے گلے سے لگا کر چمکار کر کہا "نہ بہن رومت۔ دور مارو اسے ہم تیرا دوسرا کردیں گے"!
اسپر اور قہقہہ لگا۔

اس میں تختۂ مشق بن گئی میں نے بہلا یہ تیری کبھی کاہیکو دیکھی تہی۔ دل میں کہہ رہی تہی کہ عجب تماشا لڑکی ہے کہ اتنے میں ایک اور صاحبہ آئیں جن سے ان کے بال کٹے ہوئے تھے۔ کوئی سولہ سترہ برس کی عمر۔ دوپٹہ گلوبند کی طرح بے تکلفی سے گلے میں ہار تہا۔ نہایت ہی ارکسا

چشمہ لگائے تھیں جس کی سونے کی زنجیر واسے کان کے بُندے سے اٹکا رکھی تھی۔ بڑی سہانی شکل تھی اور کس خوبی سے غازہ اُنکے گلابی رخساروں پر چمک رہا تھا کہ میں اُن کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اُن کے آتے ہی شاہدہ مجھے چھوڑ اُنپر جھک پڑی:۔

"ایلو! یہ جم والی بھی آئی" یہ کہکر شاہدہ نے ایک ہاتھ ان جم والی کے کندھے پر رکھا اور دوسرا میرے کندھے پر اور ہم دونوں کو گھسیٹ کر گویا لڑا دیا۔ یہ کہکر "تم دونوں خوب مل کے روؤ"

جھٹک کر جم والی علیحدہ ہوئیں کہ "یہ کیا بدتمیزی ہے!"

شاہدہ نے کہا "تم دونوں مل کے روؤ اسلئے کہ" میری طرف اشارہ کرکے کہا "تمہارا مرد دیوانہ ہے" پھر اونکی طرف اشارہ کرکے کہا "اور تم اسلئے کہ تمہارا میاں کانا ہے" ایک قہقہہ لگا اسپر۔

"چل دور ہو" جم والی چیخ کے بولیں "آئی وہاں سے پٹواری کی جھیتی کہیں کی"

اسپر بھی ایک قہقہہ لگا۔ معلوم ہوا کہ جن حضرت کے ساتھ شاہدہ کی شادی طے ہوئی ہے اُنہوں نے پٹواریوں کے نصاب تعلیم کے لئے کوئی کتاب لکھی ہے۔

اتنے میں صحن کی طرف سے کچھ آوازیں سی آئیں۔ شاہدہ دوڑ کے کمرہ میں گئی۔ لپک کے بجلی کی طرح واپس آئی "اری کمبخت" اس نے کہا "وہ حمیارہ چیخ رہی ہے"

یہ کہکر جلدی جلدی اُسے اپنا رومال گلے میں باندھ کے کھلا ہوا گلا بند کیا اور پھر تیزی سے سر درست کیا کہ میں دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی اور پھر دوسری طرف ایسی بھاگی کے بس غائب ہی ہوگئی۔

"دیکھا تم نے اس ستھیدں کو" جم والی بولیں" زیب چچی چیخ رہی ہیں، اب انکے پاس گئی ہے، ڈھونگ بنا کے، سب سے زیادہ وہ اس کمبخت سے راضی رہتی ہیں"

شاہدہ آڑی مانگ کی سیدھی مانگ کرے گئی تھی، یہاں پھر اُسی طرح عیبیں اڑنے لگیں، یہ جم والی بھی اب انہیں پہن پر تل پڑیں جنکی نسبت کسی ڈاڑھی والے سے ہوئی تھی۔

(۳)

یہ ہو حق ہو ہی رہی تھی کہ اُن بڑی بی کو جنہوں نے میرے اوپر اعتراض کیا تھا یعنی زیب چچی کو لیکر شاہد کمرے میں آئی اور پردہ اوٹھا کر اس نے کہا "یہ دیکھئے چچی۔۔ یہ ہو رہا ہے"

زیب چچی سی یوں کی تو دشمن ہی تھیں اُوپر سے یہ دیکھا جو گڑی دیکھی تو آگ ہوگئیں کوئی پچاس ساٹھ کی عمر۔ پرانی وضع کی بڑی بدخو ہوی تھیں تیوری پہ بل ڈالکر بولیں "بے شرموں بے حیاؤں ہٹو ابیگنیوں غضب خدا کہ میلاد شریف میں آئی ہو۔ لڑکیاں ہیں کہ گھوڑا نہ باپ کا لحاظ نہ ماں کی شرم نہ بزرگوں کا ادب نہ میزباں کا خیال، بہاڑ میں جائے یہ چھپا پا پڑی ہنس رہی ہیں ہی ہی ہی ہی"

"اور یہیں دیکھئے چچی" شاہدہ نے جم والی کا دوپٹہ کھسکا کر بال کٹا سر دکھایا۔

"موئی لونڈا کہیں کی" چچی زیب بولیں "شرم نہیں آتی موئی بیبیوں جہاں آتی ہو، کچھ کام کرتیں، میزبان کا ہاتھ بٹاتیں، دیکھو ایک شاہدہ بھی تو لڑکی ہے، جب سے آئی ہے اپنی ٹانگیں توڑ رہی ہے چلو یہاں سے"

سب کی سب ہنستی ہوئی بکھر سے ہوگئیں۔ میں الگ تھلگ ہوگئی۔ شاہدہ سب پر خفگی ڈلوا کے چچی کو لیکر واپس ہوئی۔ آگے آگے چچی اور پیچھے پیچھے شاہدہ بچوں کے مل ناچتی کودتی۔ پھرکتی چچی کی نقل کرتی چلی مارے ہنسی کے بُرا حال۔ برآمدہ سے جو ہی نکلیں ادھر لڑکیوں نے جو چچی کے پیچھے شریر شاہدہ کو انکی نقل بناتے دیکھا تو سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوگیا

اور جھٹ سے لیک کے ساجدہ سے آگے بڑھ کے چچی سے کہا۔ "دیکھا آپ نے یہ زینت کیسی آپ کو دیکھ کر ہنس رہی ہے۔"

"چچی جاہو کر لو لیں نے رینت۔ یاد رکھیو کہ ایک روز ہڈی تیری توڑ دونگی لو اد ٹسو بڑی لوٹ ہیوں پہ ہنستی ہے اور اوروں کو ہنساتی ہے۔"

"ہاں چچی جان" ساجدہ بولی "یہ سب انہیں کی حرکت ہے۔"



جلدی جلدی لڑکیاں اور بڑی بوڑھیاں سب صحن میں پہونچیں۔ وسیع صحن میں نہایت ہی پُر تکلف دستر خوان اِس سرے سے اُس سرے تک لگا ہوا تھا واقعی لڑکیوں نے بڑی ریادتی کی تھی کہ کچھ بھی میزباں کی امداد نہ کی گو اس کی ضرورت ہی نہ تھی اور درجنوں لڑکیاں اور خادمائیں تمیز سے دستر خوان چن رہی تھیں دستر خوان پر مٹھائیاں انگریزی اور ہندوستانی کیک چاکلیٹ اور پھلوں کے علاوہ وہی بڑے۔ دال موٹھ اور دوسرے لوازمات کی بہار تھی۔ کہنے کو تو چائے تھی مگر یہاں پورا پیٹ بھرنے کا ساماں تھا۔ بی بیاں بیٹھنا شروع ہوئیں مگر زین چچی کو اب بھی بڑبڑانے سے فرصت نہ تھی۔ وہ اسوقت لڑکیوں کے کھُلے گلوں اور آدھی آستینوں اور اونچے اونچے جمپروں کی تشہیر کر رہی تھیں۔ اور ایک ایک کو نام دھر دھر کے رگید رہی تھیں۔ لڑکیاں لڑکیاں سب ایک جگہ تھیں جم والی میرے داہنے ہاتھ کو بیٹھیں، بائیں ہاتھ پر بھی زینت بیٹھی تھیں اور سامنے وہ پیلی پیلی آنکھوں والی جسکے سگیتر کے ڈاڑھی تھی بساجدہ مُنتظم سی ہوئی تھی۔ زین چچی کو خوش کرنے کے لئے بادام کے چھوٹے چھوٹے کیک اس نے اُن کے آگے ڈھیر کے ڈھیر لاکر رکھ دیئے۔ علاوہ دوسری چیزوں کے پھر چائے دانی لیکر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سارے مہمانوں کو چائے پہ چائے تقسیم کرنے لگی۔

یہاں لڑکیوں کا یہ حال کہ زینب چچی کے جلدی جلدی کھانے پر ریمارک کس کے آپس
میں ہنس رہی تھیں۔ ایک نے کہا "بڑھیا کا کلا بولنے سے زیادہ کھانے میں چلتا ہے۔" دوسری
بولی "گھر سے چورن کھا کے بڑھیا آئی ہے۔" تیسری بولی "ارے دیکھو لی دال موٹھ کے پھنکے کے
پھنکے لگا رہی ہے۔ تو جل میں آیا کر رہی ہے۔" چوتھی بولی "زینب چچی دیکھو کس صفائی سے بجائے
کھانے کے تاٹ کیک پیتی ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ شاہدہ شریرے جاکر ہم لوگوں کے خلاف
معلوم کیا زینب چچی کے کان میں کہدیا "ہنستی کیوں ہو؟" زینب چچی بولیں اور پھر انہوں نے
گھور گھور کے ملاحی لڑکیوں کو سنانا شروع کیں کہ اور بھی سبکو ہنسی آ گئی۔ غرض انہوں نے
ایک ایک کر کے مہمانوں سے تمام لڑکیوں کی برائیاں گنوانے کی قسم کھائی تھی اور وہ زوروں
میں ہم سب کو جھاڑ رہی تھیں کہ شریر شاہدہ کو نئی سوجھی۔ اس نے ہم لوگوں کے کان میں آکر
کہا "دیکھو ابھی اس کترنی کی خبر لیتی ہوں۔" یہ کہکر وہ بھراں کی طرف پہونچی۔ ہم سب نے
دیکھا شاہدہ نے چچی سے کہا "چچی چائے لیجئے۔" انہوں نے انکار کیا تو وہ بولی "چچی ہماری
خاطر سے بس ایک پیالی۔" چچی ہم لوگوں کو جھاڑنے میں مشغول تھیں، برابر والی کو ایک ایک
کے عیوب گنا رہی تھیں۔ اُدھر شاہدہ نے اُنکی پیالی ہاتھ میں لیکر ٹھیک انکے سر کی سیدھ
میں کر کے اس میں چائے انڈیلنا شروع کی۔ پیالی لبریز ہو کر بھر گئی اور چائے بہہ کر پرچ میں
ہو پہونچی مگر شاہدہ نے اور چائے انڈیلی حتیٰ کہ کھولتی ہوئی چائے بہہ کر چچی زینب کی گردن اور
سر پر گری۔ "ارے!" کہکر شاہدہ نے شاید اور گرادی کہ زینب چچی یہاں تک تو پڑیں۔ ادھر انکا
بیتاب ہو کر کودنا اور اُدھر ہم سب کا ہنسی کے مارے بیحال ہونا۔ شاہدہ اُن سے سوکھے منہ
سے معافی مانگ رہی تھی۔ شاہدہ سے بھلا وہ کس منہ سے خفا ہوتیں لہذا وہ بجائے شاہدہ
کے ہم لوگوں پر برس پڑیں۔ "لو اور سنو بیوی! یہ لڑکیاں بڑی بوڑھیوں سے ٹھٹھہ بر انگیز"

یہ کہکر اُنہوں نے جوش میں آیا کہہ ڈالا۔سب بی بیاں جانتی تہیں کہ انہوں نے خود لڑکیوں سے اُلجھ اُلجھ کر اپنی اوقات خراب کی ہے۔ اور کوئی انکی طرف توجہ نہ کرتا تہا۔ ادہر لڑکیوں کا یہ سب تماشا دیکھ کے بُرا حال ہو گیا۔ میں خود ہنسی نہ روک سکی۔ ایک ایک کر کے اُٹھنے لگیں۔ کسی نے رومال سے ہنسی کو روکا تو کسی کے حلق میں مارے ہنسی کے چائے کا پھندا پڑ گیا۔ نتیجہ یہ کہ سبکی سب اُٹھ گئیں اور ہاتھ دہو کر اُسی کمرہ میں پہونچیں۔ میں بہی وہیں پہونچی۔

(۵)

یہاں اب اطمینان سے سب ملکر بیٹھیں۔ اب میں گویا سوالوں کا مرکز بن گئی۔ سوال یہ تہا کہ اپنا پورا قصہ سناؤ۔ کسی نہ کسی طرح اُڑتی اُڑاتی کہانی سن چکی تہیں، اب میری خود کی زبانی سُننا چاہتی تہیں۔ لیکن میں نے پہلے تو سب سے تعارف حاصل کیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ کون کون ہے۔ جم والی مجھے سب میں زیادہ جاذب نگاہ اور مقناطیسی کشش رکھنے والی معلوم دیں۔ انکے میاں کا نام جمشید تہا اور عرفیت جَم تہی جس کی وجہ سے یہ "جم والی" ہو گئیں۔ اِن کی زندگی بھی عجیب ہی پُرکیف تہی بوجہ اس کے کہ اِن کی شادی مسٹر جم سے جو ولایت میں تھے بذریعہ خط کے ہوئی تہی۔ یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ طرفین سے ایجاب و قبول اور گواہی وغیرہ سب کچھ دستخطی کارروائی سے بذریعہ خط ہی ممکن ہوا کرتا ہے۔ انکی خط و کتابت بھی جم سے ہو گئی تہی جس کی وجہ سے یہ عموماً ایک تخیل اور جذبات کی رنگین دُنیا میں رہتی معلوم ہوتی تہیں جیسا کہ مجھے اِن کی خود کی اور دوسری لڑکیوں کی زبانی معلوم ہوا۔ دوسرے یہ کہ اِن کے شوہر مسٹر جم خوبصورت نوجوان تو تھے ہی مگر ساتھ ہی یہ خود اُن کے بارے میں اُن کے مردانہ حُسن کی عجیب و غریب ذریعہ سے روایتیں سُنکر اور بھی مخمور ہو گئی تہیں اور وہ بھی ضرورت سے زیادہ۔ حالانکہ انہوں نے کبھی خواب میں بھی جم کو نہ دیکھا تہا۔ مگر

جو کچھ بھی سنا تھا اوس پر ایسا عقیدہ راسخ رکھتی تھیں کہ اگر کوئی کسی طرح یہ بات اشارتاً بھی کہدے کہ فلاں شخص جم سے زیادہ خوبصورت ہے تو انہیں ناگوار گذرتا تھا برا مانتی تھیں خفا ہوجاتی تھیں اور لڑمرتی تھیں۔ مذاق میں بھی کوئی برا نہ کہے یہ چاہتی تھیں جم سے تصویر منگائی جس کے آنے میں ضرورت سے زیادہ دیر ہو رہی تھی بلکہ جم کی طرف سے خطوں کو دیکھتے ہوئے حیلہ حوالہ کا شبہ ہو رہا تھا لہذا شاہدہ نے جسے یہ خط دکھایا کرتی تھیں یہ تاویل پیش کی کہ وہ کانے ہیں جب سے شاہدہ کو خط بھی نہ دکھاتی تھیں۔

شاہدہ بھی آگئی اور میں نے اپنا سارا قصہ الف سے یے تک سنا ڈالا مجھے یہ بھی اقبال کرنا پڑا کہ وہی لفظ "گولتار" جس شریر کے منہ سے سنکر تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اب وہی لفظ کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

شاہدہ اور جم والی سے میری بہت گھنٹے کے علیحدہ باتیں ہوئیں۔ فوراً عزیز ترین بہن اور سہیلی کا پاک رشتہ قائم ہوگیا۔ جم والی نے مجھ سے خود ہی کہا "بہن میں تمہارے میاں سے پردہ کاہیکو کرونگی"۔ اور پھر مجھ سے پختہ وعدہ لیا کہ تم بھی جم کے سامنے آنا۔ بھولی سے انہوں نے کہا ہمارے ہاں پردہ نہیں ہوتا اور پھر یہاں کون ایسی لڑکی تھی جو اپنی سہیلی کے شوہر کے یا بھائیوں کے سامنے نہیں آتی تھی۔

(۶)

اسکے بعد ہی میلاد شریف شروع ہوگیا صحن میں بیچوں بیچ ایک تخت بچھا کر اردگرد قناتیں لگا کر اندر مولوی صاحب یعنی میلاد خواں صاحب گویا بند کر دیئے گئے تھے اور چاروں طرف بیویاں ہی بیویاں بیٹھی تھیں۔

میلاد شریف نعتیہ کلام سے شروع ہوا۔ میلاد خواں نہایت ہی خوش الحان تھا اور

بی شاہدہ تبرّک تقسیم کر رہی تھیں، دو دو نان خطائیاں سبز کاغذ میں لپٹی ہوئی بانٹتی پھر رہی تھیں۔ ہمارے پاس آئیں تو چپکے سے بولیں "بی! یہ چنڈول کو پنجرے میں بند کر کے بستہ باندھتے ہیں تو کیوں زیادہ چہکتا ہے؟" میں اوّل تو نہ سمجھی پھر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب پر کمبخت نے حملہ کیا تھا۔

نعت خوانی کے بعد مولوی صاحب نے روایتیں شروع کیں۔ شاہدہ بھی آ کر بیٹھ گئی اور اب مولوی صاحب نے عجیب غریب روایتیں بیان کرنا شروع کیں۔ جم والی نے ناک سکیڑ کر کہا "یہی وجہ ہے جو تعلیم یافتہ طبقہ کو ان نام نہاد میلاد کی محفلوں سے نفرت ہوتی جا رہی ہے" ابھی یہ بحث ہی تھی کہ مولوی صاحب اور آگے بڑھے۔ اور ستم کرنے لگے ذرا دیر میں بیہودگی پر تل پڑے۔ ولادت کا ذکر آیا ہے تو انہوں نے ستم ہی کر دیا ایک لیڈی ڈاکٹر تھیں وہ تو یہ کہکر اُٹھ گئیں۔ "یہ تو پہلی ہے، مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ "مڈوائفری" کلاس میں بیٹھی ہوں اور دہلی کی پرنسپل صاحبہ لکچر دے رہی ہیں!" یہ اُٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ مولوی صاحب نے غضب کر دیا۔ اشرف الانساں کی یہ توہین! "اُف" کر کے بیویاں کانوں میں انگلی دیکر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور سب لڑکیاں بھی بھاگیں۔ کوئی کہتی "خدا اس سے بچائے!" کوئی کہتی "یہ مولوی مدتمیز ہے نکالو اسے!" غرض مولوی صاحب کو پنجرے میں بیہودہ بکتا چھوڑ سب دور ہو گئیں مگر مولوی صاحب برابر بکے گئے۔

اتنے میں میری گاڑی آ گئی۔ شاہدہ اور جم والی سے آنے کا پختہ وعدہ لیکر میزبان صاحبہ سے اجازت لیکر میں تو گھر چلی چلتے چلتے جم والی دوڑ آئیں اور جھپاک سے میری گلے میں ہاتھ ڈالکر میرے کان میں کہا "تمہیں سب خط دکھاؤنگی . . . جم کے!" اُس کا چہرہ محبت اور مسرت سے دمک رہا تھا میں نے کہا "اچھا!" اور رخصت ہوئی۔ سوچتی جاتی تھی کہ توبہ توبہ یہی میلاد شریف

تو اور جگہ بھی شریق تھی۔ مگر غور ہی اسمات پر نہیں کیا۔ خدا کی پناہ کسیکو خیال ہی نہیں ہوتا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ کیوں میلاد کی محفلیں لکھے پڑے روشن خیال لوگوں سے ہمیشہ خالی رہتی ہیں۔



باب ۵

جم والی

کالج کی چھٹی تھی اور مولانا مجھے انگریزی پڑھا رہے تھے کہ ایکدم سے ہمارے کمرہ کے سامنے ہی موٹر آ کر رُکا اور قبل اس کے میں باہر نکل سکوں سلام علیکم کہکر بی جم والی داخل ہوئیں۔

جم والی دیکھکر کچھ مسکرائیں۔ مولانا سے بولیں "بھائی آپ انکو بید سے مارتے ہیں یا ہاتھ سے؟"

مولانا بولے "آنکھوں سے!"

جم والی اس لایعنی جُملہ کو سُنکر چُپ ہو گئیں کیونکہ جانتی تھیں۔ غیر ذمہ دار شخص ہیں اور جو مُنہ میں آئے گا کہڈالیں گے۔ لہٰذا میری طرف مخاطب ہو کے بولیں "بہن وہ پٹواری مر گیا۔ بیچاری شاہدہ!"

"ارے!!" میں نے کہا "کب؟"

جم والی بولیں "ابھی کل مجھے وہ ریست کے یہاں ملی تھی، سب تو کچھ نہیں مگر آج ہی صبح سُنا"

مولانا بولے "تو کیا شاہدہ بی کو افسوس ہو گا!"

"خاک افسوس ہو گا!" جم والی بولیں "کوئی بات بھی ہوں کی۔ آخر آدمی مرتے ہی ہیں،

کوئی نکاح تو ہو نہیں گیا تھا۔ ابھی تو بات ہی تھی۔"

میں نے کہا "بہن بات تو تھی مگر پختہ بات تھی۔ آخر کچھ تو ہو گا۔"

"اونہہ" جم والی اپنے خوبصورت چہرہ کو بنا کے بولیں "ہو گا بہن تو اور بہیں ہو گا تو۔ چلو ذرا اُسے دیکھ آئیں۔"

"یہ جھجھٹ ہے۔" مولانا بولے "چھٹّی کے رور جو رُو گھر یہ رہتی ہے۔ اور پھر دال بھری روٹیاں پکی ہیں، تم ذرا اپنے کلیجہ پہ ہاتھ رکھ کے دیکھو بھلا میرے حلق سے کیسے اُتریں گی کیونکہ کھانے کا وقت ہے یہ جائیں گی تو کیا کھانا کھائے بغیر آئیں گی۔ موٹر تمہارا موجود ہے بی شاہدہ کو بُلالو۔ ۔"

"واہ! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔" میں نے کہا "ہم تو اس سے ہمدردی کرنا چاہتے ہیں۔ اُسے کیسے بُلالیں۔"

"دیوانی ہوئی ہو۔" مولسنا نے کہا "ذرا غور کرو۔ شاہدہ سے بھلا مرنے والے سے کیا تعلق۔"

"نہ سہی۔" میں نے کہا "میں تو جاؤں گی۔" ادھر جم والی نے اصرار کیا تو مولسنا راضی ہو گئے اور ہم دونوں شاہدہ کے یہاں پہونچیں۔ وہ کمبخت دیکھتے ہی ہمیں مسکرائی۔

"کھا گئی کمبخت بیچارے کو۔" جم والی نے کہا "ڈائن کہیں کی۔"

"چپ۔" شاہدہ نے کہا کہ اتنے میں حیرسے بہن زینت آپہونچیں۔ خالہ جان نے خوب ہم لوگوں کی خاطر کی۔ کھانا تیار ہی تھا۔ زینت کھا کر آئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد ہی ہم سب چھت پر کمرہ میں پہونچیں۔ پہونچتے ہی اوّل تو شاہدہ کو سب نے ہی مارا ایک ایک دُہوکا پیٹھ پر دیا کہ کمبخت تو کیوں اپنے میاں کو کھا گئی۔

”مجھ رنڈ ماؤ کھیاری کو مار رہی ہو دیکھو پھر بیں کھی.. ...“ جم والی نے ڈر کر منہ شاہدہ کا
لر دیا اور چپ ہو گئیں کہ رہنے دو۔

اب شاہدہ سے دلکی بات پوچھی کہ کیا واقعی تجھے افسوس ہوا شاہدہ نے دیکھا
کا ہیں تھا۔ کہنے لگی یونہی سا کچھ افسوس ہو رہا ہے وہ بھی اس ڈر کے مارے کہ کہیں کسی
ے جگہ شادی نہ ہو جائے۔ کہنے لگی ”اری بہن میرے پاس ایک رنگین گلاس شیشہ کا تھا،
غی نے توڑ ڈالا۔ رہ رہ کر مجھے اُسی کا خیال آتا رہا بس ایسا ہی اس بیچارے کے مرنے کا
س ہو رہا ہے۔ مجھے تو بیچارہ جو زندہ رہتا تو اچھی طرح رکھتا“ یہ عجیب و غریب باتیں جلد
لر کے اب جم والی کا دلچسپ قصہ سننے بیٹھی صرف یہ قصہ مجھے ہی سُنایا جانا تھا اور اس کے
ست بیقرار تھیں۔

(۲)

قبل اسکے کہ اُن کا قصہ اُنہی کی زبانی یہاں پیش کروں ضروری ہے کہ بتا دوں کہ میری
نست میں جم والی کیا ہیں؟ بس گویا دنیائے تخیل و جذبات میں رہتی ہیں، اُنکی خوبصورت
مخمور آنکھیں اُن کی نازک سی عینک کے شیشوں میں سے ہمیشہ بھیگی دکھائی دیتی ہیں،
اپنے نادیدہ شوہر سے عشقِ حقیقی ہے۔ اُسکی خیالی تصویر ہر دم گویا انکی آنکھ کے سامنے ہی رہتی
ے۔ خوبصورت سے خوبصورت نوجوان اُن کی نظروں میں حقیر معلوم ہوتا ہے محض
ں بنا پر کہ جم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار ہیں۔ انکے نادیدہ شوہر میں انکے خیال
مطابق شاید خداوند تعالیٰ نے کوئی خوبی ایسی نہیں جو نہ رکھی ہو۔ زینت اور شاہدہ سے
موشی کا وعدہ لیکر آتش جمال جم والی نے اپنا قصہ اس طرح شروع کیا۔

جم والی کی زبانی

"بہن میں کیا بتاؤں کہ تجھ سے مجھے کتنی محبت ہے اور وہ شاید اسوجہ سے کہ۔۔ "
جم والی نے شاہدہ اور زینت کی طرف دیکھا اور اُن دونوں سے چھپا کر میرے گلے میں ہاتھ ڈالکر کان میں مسکرا کر کہا "اسلئے کہ۔ ۔۔۔"
کھٹاک سے شاہدہ نے ہم دونوں کے سر زور سے لڑا دیئے۔
جم والی نے اپنا سر پکڑ کر کہا "کمبخت۔ تجھے خدا سمجھے" ادہر میرا اور زینت کا ہنسی کے مارے بُرا حال۔ معلوم کیا بیچاری کہنے والی تہیں جو باز رہی گیں کہنے لگیں "میں تمہیں بعد میں بتادونگی" میں نے کہا "بہتر ہے اسوقت تم مریدار قصہ سناؤ" جم والی نے اس طرح اب قصہ شروع کیا۔
"پرسوں کا ذکر ہے میں بڑی بیچینی سے چوکیدار کا انتظار کر رہی تہی۔ اتوار کے دن ولایتی ڈاک آتی ہے اور جم کا خط خود آتا ہے۔ میں صبح جلدی چوکیدار کو ڈاکخانہ بہیج دیتی ہوں۔ تکتے تکتے آنکھیں پتھر ہوگئیں کیونکہ خط کے ساتھ مجھے تصویر کا ہی انتظار تہا۔ آخر کار چوکیدار کمبخت پہاٹک میں داخل ہوا۔ اُسے کیا خبر کہ میں کس تکلیف میں ہوں' وہ مزے میں ٹہلتا چلا آرہا تہا کہ کسی سے باتیں کرنے کھڑا ہوگیا۔ میں روہانسی ہوگئی اور میں نے لڑکے کو دوڑایا۔ اس نے خط لاکر میرے ہاتھ دیا۔ بہن کیا بتاؤں میں نے کس طرح خط کہولا ہے۔ جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ کچھ افسردہ سی ہوکر رہ گئی۔ کیونکہ صرف دو چار ہی سطریں تہیں۔ یہ خط ہی جو ہے دیکھہ لو" یہ کہکر جم والی نے خط نکالکر دکھایا جو حسب ذیل تہا۔۔
جم والی کو خوش رہو اور جلدی ملو۔ کیا بالکل ہی دیوانی ہوگئیں۔ کہتا ہوں ناکہ تصویر تمہارے پاس پہونچ جائے گی۔ آخر جلدی کیا ہے ڈاک سے یا اور کسی طرح غرض جلد پہونچے گی۔ دیگر حال

اسوجہ سے ہورہی ہے کہ جو تصویریں بھیجنا چاہتا ہوں اسکی تیاری معمولی کام نہیں جم والی نے جم کو کبھی نہیں دیکھا ہے اور نہ جم نے اسکو۔ مگر یہ درحصل غلط ہے۔ کیونکہ کسیکو بھی تصویر کی ضرورت نہیں۔ سچ کہتا ہوں نا؟ فقط ملیں گے جب

"جم"

میں نے پہلا ایسا چیتان خط کا ہیکو دیکھا یا سُنا تہا میں نے دو ایک سوال کئے کہ شاہدہ بولی "بہن ہو بہو یہ اسکے جم . کا ... "جم والی نے قتل" کا نے"۔ کہنے کے شاہدہ کا منہ بند کردیا اور کہا چُپ رہو۔ میں نے ہی کہا کہ بہن قصہ ختم کرنے دو۔ جم والی نے پھر کہنا شروع کیا۔

"سب سے پیشتر میں جم کا خط اسے دکہاتی ہوں" رینت کی طرف مسکرا کے جم والی بولیں۔ "کیونکہ یہ پڑوس میں ہے۔

ایک دم سے خط پڑہکر میں لیے کمرہ سے نکل کر سیدھی سُرقعہ لعل میں داب تیر کی طرح بنگلہ کی دیوار پار کر کے کھیت میں ہولی۔ کوئی نہ تہا۔ کیا خوشگوار ہوا تہی ورمیں گویا چشم زدن میں کھیت ڈیڑھ ایک کا فاصلہ طے کر کے اِس کے بنگلہ کی پشت پر گھوم کے پہونچی باغ میں داخل ہوئی۔ کس قدر میری طبیعت خوش تہی اور باغ کا خوشگوار سناٹا! کیلوں کی قطار کے برابر روش پر مجھے تیزی سے دوڑنے میں عجیب ہی لطف آیا اور میں اُڑی ہوئی بنگلہ کی پشت والے برآمدہ کے پاس نکلی اسی برآمدہ کے اوپر اِس کا (رینت) کمرہ ہے"۔

رینت مسکرا رہی تہی اور شاید ہنسے ہی والی تہی کہ جم والی نے بات چھوڑ کر اپنی سرمگیں آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا کر کے کہا "کمبخت تو ہنستی کیوں ہے؟ بیچ میں بولی تو بس ... " اتنا کہکر پھر بولیں۔

"برآمدہ کے پاس مالی بیٹھا کچھ کھود رہا تہا۔ مجھے جانا ہی تہا اور میں نے جلدی میں زینت کو ہاتھ

کے اشارہ سے پُوچھا۔ اُسنے جواب میں ہاتھ اُٹھاکر کچھ کہا مگر میں بھلا کہاں سُنتی تھی۔ میں جلدی کی ماری کمبخت دو دو سیڑھیاں چڑھتی چھت پر پہونچی برآمدہ میں کمرہ کے دروازہ کے پاس آئینہ میں مَیں نے اپنا تمتمایا چہرہ دیکھا۔ ذرا رُک گئی کہ سانس قابو میں آجائے۔ کیونکہ جھانک کے میں نے کمرہ دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ ایک لحہ بھر بعد بُرقعہ آئینہ کے پاس رکھ کے میں کمرہ میں داخل ہوئی اور بیچوں بیچ کی چھوٹی میز پر میری نظر پڑی خط لکھنے کا کاغذ اور قلم رکھا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی خط لکھنے والا تھا۔ میں گھومی جو بھی تو پلنگ کی طرف اب نظر پڑی۔ میں سمجھ گئی کہ زینت نے وہی پرانی شرارت کی ہے"

زینت سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ ہنس پڑی میں نے پوچھا "کیا شرارت؟" تو جم والی بولیں

" اس کی پُرانی عادت ہے کہ جب کبھی مجھے آتا دیکھتی ہے تو سو کام چھوڑ جھٹ سوتی بن جاتی ہے۔ اور پھر اُٹھائے نہیں اُٹھتی۔ ذرا غور کرو کہ میں تو شوق اور محبت سے دوڑی آؤں اور یہ سوتی بن جائے اور گھسیٹے سے نہ اٹھے۔ میں نے دیکھتے ہی دل میں کہا کہ ہرگز یہ نہیں سو رہی ہے بلکہ مجھے بڑا معلوم ہوا کہ یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ ابھی ابھی مجھے دیکھکر خط لکھتے لکھتے چھوڑ چھاڑ چادر اوڑھ لیٹ گئیں مجھے تنگ کرنے کو۔ چاہتی ہیں نا کہ آئے گی آج خط دکھانے ایسی خوشگوار ہوا میں چادر کا اوڑھنا؟ محض اسلئے کہ جب میں کھینچ کر جگاؤں اور بھی آئے تو چادر میں منہ چھپائے ہنستی رہیں میں نے بھی دل میں کہا کہ رہ جا۔ نہ تیری آج وہ خبر لی ہو کہ یاد ہی کرے۔ اب میں سوچی کہ کیا سزا دوں پہلے تو خیال آیا کہ لاؤ بڑا تکیہ لیکر اسکا ذرا دم گھونٹوں پھر میری سمجھ میں ایک اور ترکیب آئی۔ اس کی ناک ایسی آج دھر کے مروڑوں کہ ہاتھ ہی میں ٹوٹ کے رہ جائے! یہ ٹھان کر میں آگے بڑھی اور اچھی طرح اپنی دانست میں اس کمبخت کو ایک دم سے دباکر اس زور سے ناک پکڑ کر مروڑی ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں ......"

اسپر زینت اس بُری طرح ہنسی کہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ شاہدہ کا بھی یہی حال ہوا اور خود

جم والی کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوا میں نے کہا "خدا خیر کرے بہن۔ دیوانی ہوگئیں سب
بات بات ہنسی مرتی ہو؟"

ہنسی روکتے ہوئے حم والی نے کہا "یہ ہوا بہن یہ ہوا کہ ادھر میں نے اس کمبخت کو اچھی طرح
داب کر ناک مروڑی ہے کہ اُدھر اس نے زور کیا میں نے کچھ روکا۔ کیونکہ اچھی طرح دابے تھی کہ
پہلوان کے سے زور کے ساتھ مجھے ایک جھٹکا لگا "ہیں" کرکے چادر ایک دوسرے جھٹکے کے ساتھ
وہ گری! ... "کون!" گھبرا کر زور سے مجھے ڈپٹا۔ بس چیخ پڑی اور میرا ہاتھ ایک نوجوان کی مضبوط
گرفت میں تھا!!"

زینت اور شاہدہ تو ہنسی سے بیتاب ہوگئیں۔ مجھے ہنسی آتی کیا خاک۔ سخت متعجب ہو کر میں
نے کہا "مذاق کرتی ہو۔ کیا واقعی ..... کون تھا ۔"

حم والی بولیں "مذاق کاہیکا۔ سچ کہتی ہوں۔ بالکل سچ۔ اے بہن میں کیا بتاؤں کہ میرا کیسا
حال ہوا۔ کہنے کو پردہ کرتی ہوں اور رہیں بہی مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا میں نے ایک نظر حیرت
میں چار کرکے دوسرے بازو سے اپنا منہ چھپایا اور زور کیا۔ مگر ہاتھ میرا گویا شکنجہ آہنی میں تھا "یا رحمت!
انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا "آخر تم ہو کون بلا؟" یہ کہہ کر دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا
مگر میرا منہ اب دوسری طرف تھا کہ عین اس مصیبت کے وقت میں اللہ بھلا کرے اس کا زینت
پہونچی ... "

"میں کیا بتاؤں بہن میں نے کیا تماشہ دیکھا" زینت بولی "دوڑ کر میں نے بنو بی کو چھڑایا۔
"یہ حم والی ہماری بہن جم والی ہیں خدا کے واسطے انہیں چھوڑتے" یہ کہہ کر میں نے بھائی نجمی
کی انگلیاں چھڑانا چاہیں "

"اچھا! یہ ہیں حم والی .. . مگر، . یہ علت ہے" بھائی نجمی نے کہا "انہیں

دیکھیں تو یہ کیسی ہیں" یہ کہکر وہ ہاتھ موڑنے لگے۔ میں نے کہا "بھائی چھوڑ دو نا۔ کوئی تم سے پردہ تھوڑا ہی ہے" وہ بولے "پردہ وردہ یہ کیسے کریں گی ۔ ۔ مجھ سے" یہ کہکر پھر اُنھوں نے اِن کا ہاتھ اینٹھا مگر میں نے چھڑایا اور اِن کی مُنہ دکھائی کرائی ۔ سامنے کرسی پہ اِن کو بٹھا یا گیا۔ اِن کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بھائی نجمی بولے" یاد رکھنا جو ہلیں ہی کرسی پر سے تو دوڑ کر پکڑ لوں گا۔ آئیں وہاں سے ناک مروڑنے والی"

"میں سہمی ہوئی بیٹھی رہی ہی! اور کیا کرتی" حم والی بھولے پن سے بولیں۔

زینت نے کہا " پھر میں نے بھائی نجمی کو سمجھایا کہ کس طرح میرے دھوکہ میں انکی ناک مروڑی گئی مگر اِس پر وہ بولے "اِنھوں نے جان بوجھکر مروڑی ہے۔ بچہ تھوڑا ہی ہیں پیر دیکھکر صورت کا پتہ لگانے والیوں میں ہیں یہ ۔ ۔ ۔ جیسے اِن کے حم ہیں"

"مجھے بہت ہی بُرا لگا" حم والی بولیں۔ "یہ سُنکر مجھے بہت بُرا معلوم ہوا کہ وہ بولے۔ ہمیں حم کا خیال آتا ہے ورنہ ہم تو اِنہیں کھا ہی جاتے"

"تو کیا تمہارے حم کے دوست ہیں" میں نے پوچھا۔

"ہاں سُنو نا" حم والی بولیں۔ "یہی تو بات تھی ۔ بڑے گہرے دوست ہیں ... رات ہی کو ولایت سے آئے ہیں۔ حم کے پاس سے۔ مجھے بُلوانے والے ہو ہی رہے تھے۔ میں چُپ بیٹھی تھی کہ اُنھوں نے اِس کمبخت (نتاہدہ) والا مذاق کیا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ کہ "آخر تمنے کانا آدمی کیوں پسند کیا۔ تمہارے حم سے تو لاکھ درجہ میں اچھا ہوں"

"بس بہن میں کیا بتاؤں۔ میرے اوپر گویا بجلی گری۔ تن بدن میں ایک ٹھنڈک سی بیٹھ گئی۔ اس قسم کے بیہودہ الفاظ! میرے کانوں میں جیسے کسی نے برچھی ماری۔ میں گویا ایک سناٹے میں آ گئی کہ ایک دم سے مجھے غصہ آیا۔ آگ سی بدن میں دوڑ گئی۔ ہکلاتے ہوتے میں نے سخت

غصہ میں نہ معلوم کس طرح کہا: "آپ قطعی اس قسم کا مذاق نہیں کر سکتے۔"

اس کے جواب میں نجمی نے اپنے خوبصورت چہرہ کو پُرمذاق بنا کر عجیب شگفتگی سے اپنے ہاتھ سے اپنی ناک مروڑ کر کہا: "آپ قطعی "اس" قسم کا مذاق نہیں کر سکتیں۔"

مجھے کچھ ہنسی سی آگئی تو انہوں نے اور بھی بری طرح کہا: "تمہارے 'کان ٹین' جم بھی عجیب آدمی ہیں ..."

اب میں بگڑ کھڑی ہوئی اور میں نے کہا "بھائی آپ جم کو ... "

بات کاٹ کر انہوں نے کہا: "بھائی ہونگے تمہارے گھر اور رہے جم تو انکو ڈالو چولہے میں۔"

اب مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی میں نے گھٹی ہوئی آواز میں برا مانکر ان سے زینت سے، کہا "بہن مجھے معاف کرو اور اب جانے دو۔" اتنا کہکر گم سُم ہو کر میں کرسی پر اپنی کہنی سے منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

زینت نے بھی شکایت کی کہ اس قسم کا برتاؤ ٹھیک نہیں اور قائل کرنا چاہا تو بجائے قائل ہونے کے پُرزور لہجہ میں بولے: "جانتی بھی ہو میں کون ہوں؟ کون ہوں؟ .. . بولو... اے جم والی . بولو . . "

میں کچھ نہ بولی تو زینت سے بولے: "بہن لانا تو میرا اٹاچی . . یہ ایسے ٹھیک نہ ہو گی۔ ذرا لانا تو میرا اٹاچی میں انہیں ابھی ابھی ٹھیک کر دوں۔"

زینت نے اٹاچی کیس اُٹھاتے ہوئے کہا: "کیوں؟ اس میں کیا ہے؟" وہ بولے۔ "اس میں ایک دوا ہے۔"

اب میں غور سے نجمی کے خوبصورت اور روشن چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ واقعی نجمی خوبصورت نوجوان ہیں اور میرے سامنے اپنے جم کی گویا تصویر پھر گئی جو نجمی سے بھی لاکھ درجہ دمسکرانے

لگیں جم والی/ ..... ہاں۔ تو انہوں نے اٹاچی کیس میں سے کچھ کاغذ نکالکر چھپالیا اور اب مجھ سے تحکمانہ لہجہ میں کچھ ڈانٹ کر کہا۔ "بولو جلد ... جلدی بولو ... جانتی ہو میں کون ہوں" میں غصہ میں بھری اسی طرح چپ بیٹھی رہی تو کہا "تم یوں نہ مانو گی جب تک .... "

یہ کہکر ایک کاغذ کو میرے سامنے کیا۔ یہ ایک لفافہ تھا۔ میں ایک دم سے چونک سی پڑی کیونکہ یہ تو میرا لفافہ تھا! وہ لفافہ جس میں بند کر کے میں نے جم کو ایک خط بھیجا تھا۔ پتہ کی طرف سے مجھے دکھا کر نجمی نے کہا۔ "یہ خط پہچانتی ہو؟" اپنی ہی تحریر بھلا کیسے نہ پہچانتی۔ میں نے فوراً پہچان لیا اور بےچین سی ہو گئی کہ یا اللہ کہیں اس لفافہ کو مع میرے خط کے اس ظالم نے جم کے پاس سے نہ اڑا لیا ہو۔ میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ معاً انہوں نے کہا۔ "اجی منشی جی یہ خالی نہیں ہے۔ اس میں آپ کا خط بھی ہے۔" یہ کہکر انہوں نے اس میں سے خط نکالا۔ میں دھک سے ہو گئی اور لپک کر اٹھی۔ یہ کہتی ہوئی۔ "میرا خط!" "خوب!" انہوں نے اپنے خوبصورت چہرہ کو سنجیدہ بنا کر کہا۔ "سبحان اللہ! خط میرا ہے۔ بہشت"

خط ان کے ہاتھ میں تھا اور میں نے چڑچڑا کر کہا۔ "میرا خط لائیے" یہ کہکر میں نے لینا چاہا "میں ابھی اسکو زور زور سے پڑھ کر سناؤں گا ورنہ یہ بتاؤ کہ جانتی ہو میں کون ہوں۔" انہوں نے کہا اور ساتھ ہی خط پڑھنے کو ہوئے۔

میں نے ہار کر جلدی سے کہا۔ "ہاں جانتی ہوں۔"

خط سامنے سے ہٹا کر کہا۔ "کون ہوں؟" انکے چہرہ پر مسکراہٹ اور شرارت عیاں تھی۔ "جم کے دوست ہیں آپ۔" میں نے کہا۔ "مگر آپ نے سخت زیادتی کی اگر یہ خط ان کے پاس سے چرا لیا۔"

"میں جم کا دوست ہرگز نہیں اور نہ میں نے یہ خط چرایا۔"

"پھر"
"پھر" نخمی نے اپنے خوبصورت چہرہ کو جما کر کہا۔ "تم جانتی ہو جم کے کوئی بھائی سگا سوتیلا کوئی نہیں۔ اور یہ بھی جانتی ہو کہ اس کے صرف ایک چچا ہیں۔"
"جانتی ہوں!" میں نے کہا۔
"پھر کیا ہے!" انھوں نے کہا۔ "تو بس مجھے تم اُن کے چچا کا سگا بھتیجہ سمجھو۔"
"میں یہ مکروہ مذاق ہرگز پسند نہیں کر سکتی!" جلکر میں نے بیہودگی کا جواب دیا۔
"میری بلا سے!" انھوں نے لاپرواہی سے کہا۔
"میں ناشائستہ لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتی!" میں نے انتہائی جرأت سے کہکر خط کیطرف ہاتھ بڑھایا۔
"میں خوبصورت لڑکیوں کے خط پڑھنا چاہتا ہوں جو وہ ناشائستہ لوگوں کو لکھتی ہیں"۔
اور یہ کہکر ہاتھ اونچا کرکے خط میں نہ چھین سکوں میری آنکھوں کے سامنے خط نچا کر اوسکو پڑھنا شروع کیا...... "میرے جم۔ "
انھوں نے اتنا ہی پڑھا تھا کہ میں چیخ کر جھپٹی کہ خط لیلوں اور ناکام ہو کر روتی ہوئی منہ چھپا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ رومال میں منہ چھپا کر میں رونے لگی۔
اسپر یہ زینت چلائی تو نخمی بولے: "ایلو بگڑ گئیں جم والی بگڑ گئیں۔ یہ لو۔ یہ لو ... یہ لو .. بس بس۔ " یہ کہکر خط کو چاک چاک کر ڈالا۔
اس نے (زینت نے) بھی کہا: "آپ ضرورت سے زیادہ مذاق کرتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ....."
بات کاٹ کر نخمی نے کہا "تم بھی اِس کے رونے پر جاتی ہو۔ یہ ٹری فیل ہائی معلوم ہوتی ہیں۔

اِن سے کہو کہ ہنسیں . . ابھی . . . ا میری طرف مخاطب ہو کر کہا . ہنسو جی . . ہنستی ہو کہ نہیں . . "

مگر یہ بھونڈا مذاق مجھے اور بھی زہر معلوم ہوا اور میں اور بھی سلگ گئی۔

"لانا تو میرا اٹاچی کیس" نجمی نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ "ایسے یہ نہیں ٹھیک ہونگی اور دیکھتی کیا ہو۔ قسم ہے خدا کی تمہیں، لاؤ تو پھر دیکھو تم نیا تماشہ"

میں نے دل میں کہا کہ نمعلوم اس سے کیا مطلب۔ میں اُسی طرح ملول اور کبیدہ تھی مگر نجمی کو غور سے اسوقت دیکھ رہی تھی۔ ان کا خوبصورت چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔

یہ اُٹھی اور اٹاچی کیس پھر اُٹھا لائی۔ اب میں بھی آنسو پونچھکر غور سے دیکھنے لگی کہ یہ حضرت کیا کرتے ہیں۔ میری طرف دیکھ کے بولے "ہنسو جلدی" مگر مجھے قطعی ہنسی نہ آئی بلکہ بھونڈے پن پہ اور غصہ آیا۔ جلدی سے اُنھوں نے اپنا اٹاچی کیس کریدکر ایک لفافہ نکالکر میرے سامنے کر دیا۔

بس کیا بتاؤں میں پہلے سے بھی زیادہ متعجب ہو کر چونک پڑی جس کا خط پہچانتی ہوں اس لفافہ پر میرا پتہ لکھا ہوا تھا، خط میرے نام تھا! قبل اس کے میری زبان سے کچھ نکلے لفافہ گھما کر اُنھوں نے دوسری طرف مُہر دکھا کر کہا "اطمینان رکھو میں نے کھولا نہیں ہے۔ خط تمہارے نام ہے" میں نے جس کی مُہر کو بھی پہچان لیا۔ اب انھوں نے کہا "ہنسو جلدی" اور میں کمبخت واقعی ہنس دی۔

نجمی ایک دم سے اب کھڑے ہو گئے اور میں نے اب اُن کو سرتا پا دیکھا۔ کشیدہ قامت اور اُنکے مردانہ حسن کو میں نے دیکھا۔ اُن کے خوش رنگ بال دیکھنے میں ریشم کی طرح تھے اُنھوں نے اپنے بال ماتھے پر سے سمیٹے اور اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر کہا "ذرا مُنہ دھو ڈالو" مگر میں نجمی کو

دیکھکر جم کا نقشہ دل میں کھینچ رہی تھی۔ جو کچھ بھی جم کے بارہ میں سُنا ہے اس کا کچھ عشر عشیر میں نے دل میں کہا نجمی میں بھی ہے۔ نجمی کے بالوں کو میں نے ایک نظر پھر غور سے دیکھا جم کے بالوں کو تو کیا پھونچیں گے؟ میں نے دل میں سوچا مگر بال نجمی کے بھی کچھ کچھ ویسے ہی ہیں۔

نجمی نے پھر کہا۔ "ذرا مُنہ دھو ڈالو . مگر خیر ابھی نہیں۔ اب تو یہ خط لو" میں گویا چونک سی پڑی خط لیا اور اسکو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولکر پڑھا۔ خط کیا ایک مختصر سا نوٹ ہے" یہ کہکر حم والی نے وہ خط نکالکر دیا جو حسب ذیل تھا۔

"حم والی۔ یہ نجمی ہیں۔ گویا جم .... بالکل. ... الگ الگ نہیں...... حم اور نجمی کی دوستی ؟ ایک جان دو قالب نہیں بلکہ ایک جان اور ایک قالب سمجھا تصویر کے بارہ میں نہیں لکھ چکا۔ ابھی وہ تصویر تیار نہیں جو بھیجنا چاہتا ہوں' پھر حم کی تصویر کی حم والی کو ضرورت ہی نہیں مگر ان کے پاس ہے تو اوس پر میرا زور نہیں۔ ہاں کوشش کر کے لیلو۔ شاید دیدیں۔ یا کم از کم دکھا دیں۔ فقط تمہارا حم۔

"کہئے منشی جی" نجمی نے ہنسکر مجھ سے کہا "اب تو مانتی ہو کہ ہوں حم کے سگے چچا کا سگا بھتیجہ"

میں ہنس رہی تھی اور نجمی نے اپنی خوبصورت پلکوں میں عجیب طرح آنکھیں گھما کر زینت سے کہا "دیکھا تمنے اس چھوکری کو! ہو گئی نا مجھ سے راضی میری مُرید !!"

میں واقعی بیحد خوش تھی کہ ایسا اچھا آدمی حم کا ایسا گہرا دوست ہے۔ ایک جان اور ایک قالب! میرا دل خوشی سے لبریز تھا اور مجھے اب نجمی کی تمام گذشتہ بدتمیزیاں اور گستاخیاں حق بجانب اور دل پسند معلوم ہو رہی تھیں۔ جم کا اتنا گہرا دوست اتنا خوبصورت خوش مزاج دلچسپ شخص!

"لو اب مُنہ دھو ڈالو" نجمی نے کہا۔

"آپ کے پاس کیا تصویر ہے؟" میں نے پوچھا۔
"کس کی؟"
"حرم کی،" میں نے مسکرا کر کہا۔ "حرم کی تصویر۔ ۔ ۔ ہے آپ کے پاس؟"
"دیکھو گی؟"
مسکرا کر میں نے سر ہلایا۔

"دیکھو،" کمی نے کہا۔ "قاعدہ ہے کہ کسی خوبصورت اور شکیل جوان کی زیارت کرتے ہیں تو اس سے پیشتر وضو کر لیتے ہیں۔ لہٰذا تمہیں ایک نہایت ہی قابلِ پرستش، خوبصورت اور لایق و قابل نوجوان کی تصویر جب دکھاؤں گا جب تم وضو نہیں کم از کم منہ دھو ڈالو۔"
یہ کہکر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے برآمدہ میں لا کھڑا کیا اور لوٹا ہاتھ میں لیکر کہا۔ "لو۔" میں ہنسنے لگی، زینت بھی پاس آ کھڑی ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ میں منہ نہیں دھوتی تو لوٹا رکھکر کہا، "قسم ہے مجھے بھی بغیر منہ دھوئے تصویر نہ دکھاؤں گا۔" یہ کہکر مجھے اور زینت کو چھوڑ کر کمرہ میں جا بیٹھے۔ میں ہنسنے لگی اور میں نے کہا۔ "لیجئے میں دھوتی ہوں۔" یہ کہکر میں نے منہ دھویا کیونکہ جانتی تھی کہ سحر سے سابقہ ہے نہ مانے گا اور ادھر میں تصویر دیکھنے کو بیحد بیچین تھی۔ جلدی سے منہ دھو کر میں کمرہ میں آئی کہ یہ حضرت تولیہ لیکر بڑھے اور کہا۔ "لاؤ میں پونچھ دوں۔" یہ کہکر میرا منہ پونچھ ہی دیا ہوتا۔ اگر میں سر اوپر کو کر کے ہاتھ نہ روک دیتی۔ میں نے کہا، "میں پونچھے لیتی ہوں۔" یہ کہکر میں نے تولیہ لیکر منہ پونچھا۔

جب منہ پونچھکر میں نے کہا کہ تصویر دکھاؤ تو اس کے جواب میں زینت سے بولے، "بہن زینت ذرا لڑکی صورت دیکھنا میری تصویر دیکھنے کے شوق میں مری جا رہی ہیں۔"
میں نے اس مذاق پر ہنسکر کہا۔ "آپ تو باتیں بناتے ہیں۔ دکھانا ہو تو لائیے تصویر۔" میں

درصل تصویر دیکھنے کے لئے سخت بےچین ہو رہی تھی۔

"موجود تو ہوں سامنے تمہارے" نجمی نے کہا "کیا کروگی دیکھ کے تصویر کا۔ بیکار" یہ مجھے سخت بیہودی تھی اور میں نے اس بیچینی سے تنگ آکر کہا "آپ کو تو مذاق کی سوجھی ہے۔ بھلا ایسا بھی کیا مذاق" زینت نے بھی کچھ رد و ردیا تو اُٹھے اور اپنا ٹرنک کھولکر تصویر نکالی ادھر میرا یہ حال کہ تصویر دیکھنے کے اشتیاق میں بیچین تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ نجمی کے خوبصورت چہرہ پر ایک عجیب ہی قسم کی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں بھی وہی شرارت کی چمک تھی۔ پھر مجھے جم کا ایک دم سے خیال آگیا کہ جم نجمی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں ابھی تصویر ہی ثابت کر دیگی کہ جم سے کیا علاقہ۔

"کیوں نہیں" جم والی سے میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آخر تمہیں کیسے معلوم کہ قطعی طور پر تمہارے جم نجمی سے زیادہ خوبصورت ہیں"

"مجھے کیا معلوم؟" جم والی چیں بہ جبیں ہو کر بولیں "میں نے تو اتنی تفصیل سُنی ہے کہ مجھے ان کے شکل صورت اور چہرے مہرے کی اتنی مشرح تفصیل معلوم ہے کہ۔ ... بس .. بس گویا سمجھو پوری . . "

شاہدہ بیچ سے بات کاٹ کر بولی "یہ سچ کہتی ہیں انہیں جم کے چہرہ کی پوری کی پوری تفصیل معلوم ہے سوائے ایک آنکھ کو چھوڑ کر"

"پھر وہی" جم والی ایک دم سے تیز ہو کر بولیں "اب کیا بیچارے مرے کو سنوانا . . ."

نہیں زینت نے جم والی کا شبہ ہدکر دیا اور روکا کیونکہ جم والی شاہدہ کو گھیٹنے نہ رہی تھیں بس جملہ معترضہ کے بعد جم والی نے پھر اپنا قصہ شروع کیا۔

"مختصر میں تصویر دیکھنے کے لئے بےحد بیچین تھی۔ نجمی نے مسکراتے ہوئے تصویر میز پر رکھکر کہا۔

"لو دیکھو مگر ایک دم سے نہیں دکھاؤں گا" یہ کہکر ایک کاغذ سے تصویر کو پورا کا پورا چھپا لیا۔

میں ہنسی اور ہمہ تن شوق بنی ہوئی اُٹھی میرا دل جم کے دیکھنے کے لئے بیقرار تھا میں نے کہا "دکھائیے"۔

نجمی نے کہا "ایسے بڑے! معزز! عالی خاندان! بہادر! خوبصورت! حسین و جمیل اور قابلِ پرستش نوجوان کی تصویر دیکھنے سے پہلے لازمی ہے کہ تم قدمبوسی کرو یعنی پہلے اس کے مبارک قدم کی زیارت کرو"۔

یہ کہکر نجمی نے کاغذ کو اوپر سرکا کر تصویر کے پیر دکھائے۔ زہے قسمت میں نے دل میں کہا میں نے دیکھا کہ ایک قالین بچھا ہے رنگ برنگ کا اور اسپر پیر میں سیاہ جوتا اور کتھی دھاری دار پتلون۔ تصویر تو ٹوکی تھی مگر اس میں رنگ کس خوبی سے بھرے گئے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے نجمی کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا "پوری دکھائیے"۔

نجمی نے کہا "آہستہ آہستہ" اور یہ کہکر کاغذ اوپر کو سرکانا شروع کیا میری آنکھوں میں گویا ایک روشن اور منوّر سماں سا معلوم ہو رہا تھا۔ دل اندر سے باغ باغ تھا اور ایک عجیب پردہ سا آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ رہا تھا جو دلکو خوشی سے معمور کئے دیتا تھا میں نے کوٹ تک دیکھا۔ پتلون ہی کے رنگ کا کوٹ تھا۔ ہاتھ دیکھے کسقدر عمدگی سے کوٹ میں مصوّر نے رنگ بھرے تھے۔ نجمی نے کاغذ اور سرکایا تو ٹائی سٹر یٹ میرے سامنے پوری تصویر سوائے چہرہ کے تھی اور میں نے اب نجمی کا ہاتھ گویا جذبۂ اشتیاق سے بے قابو ہو کر ہٹانا چاہا مگر نجمی نے زور سے کاغذ دبایا۔ میں نے بیچینی سے پریشان ہو کر کاغذ کو نوچ لیا کہ "یہ لو" کہکر نجمی نے تصویر بالکل میرے مُنہ سے لگا دی۔ ہٹتے ہوئے میں نے تصویر کو دیکھا مگر نظر پڑتے ہی روح سلگ گئی۔ دل جلکر کباب ہوگیا۔ تن بدن میں مارے غصّہ اور چڑھ کے آگ لگ گئی اور مارے غصّہ کے میں نے ہاتھ سے چھین کر تصویر پھاڑ کر پھینکی کیونکہ تصویر خود نجمی کی تھی۔ چڑچڑا کر اور جُھنجھلا کر میں نے کہا "یہ بھی کوئی مذاق ہے"۔

"مذاق تو بس دنیا میں ایک ہے" انجی نے مجھے چڑاتے ہوئے سر ہلا کر کہا: "اور وہ یہ" یہ کہکر اپنے ہاتھ سے خود اپنی ناک مروڑی اور کہا: "اور یہ مذاق کوئی ہماری چنچل جم والی سے سیکھے"

میں ایسی غصّہ میں جل رہی تھی کہ ذرہ ہنسی نہ آئی۔ البتہ اسکا (زینت کا) مارے ہنسی کے بُرا حال ہو گیا۔

"اُٹھاؤ تصویر کو جا کے" نجمی نے کہا۔

"مت بولئے مجھ سے" میں نے تیز ہو کر کہا۔

"ہیں!" نجمی نے اپنے شاندار چہرہ کو کچھ خوفزدہ سا بنا کر کہا: "یہ غصہ اور پھر وہ بھی کس سے؟ ارے مجھ سے؟ مجھ سے؟ کیا بھول گئیں اتنی جلدی۔ کون ہوں میں؟ کون ہوں....؟"

بخدا میرا غصہ ایک دم سے جاتا رہا۔ جم کے خط کا خیال آگیا۔ دل میں میں نے کہا کہ جم کی خاطر مجھے اس شریر کی ہر بات سر آنکھوں پر تھی۔ جس مذاق نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی اُسی مذاق کا میں شُستہ پہلو ڈھونڈھنے لگی۔ میں نے شکایت کے لہجہ میں کہا: "آپ ہی تو خواہ مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہیں" ہنسکر میں نے کہا "آپ کیوں نہیں دکھاتے"

"اب کیا دوسری تصویر دیکھو گی؟ اچھا پہلے اُسے اُٹھا لاؤ۔ اُٹھو۔ اُٹھو جلدی۔ ."

میں کمبخت جم کی تصویر دیکھنے کے لئے بیچین تھی۔ جھک مار کر اُٹھی۔ میرے ہاتھ سے تصویر لیکر نجمی نے کھوئیں چڑھا کر رازداری کے لہجہ میں کہا: "کہتی تو ہوگی دل میں کہ ہے تصویر کسی.. کسی خوبصورت آدمی کی"

"تو آپ کو بدصورت کون کہہ رہا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کو تصویر دکھانا ہو تو دکھائیے"

"تصویر تو میں دوسری تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔ مگر تم نے صبح صبح میری ناک دوہر مڑوری اور جگا دیا اور اب جاتا ہوں میں غسل کرنے اس کے بعد پھر دھو کر ناشتہ سے فارغ ہو کر سوچوں گا کہ دکھاؤں بھی یا نہیں۔ کیونکہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ آخر دوسری تصویر کا دیکھ کر کیا کرو گی جبکہ وہ بھی ہو بہو ایسی ہی ہے صرف فرق اتنا ہے کہ یہ رنگین ہے اور وہ دوسری سادی۔"

"تو یہ کہئے کہ جم کی تصویر ہی آپ کے پاس نہیں ہے۔" میں نے مایوس ہو کر کہا۔

"دکھا تو دی۔" انہوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "اور کیا جم کے کوئی سینگ ہوتے جب مانتیں۔"

زینت نے اسپر تنگ ہو کر میری سفارش کی تو بھی نے وعدہ کیا کہ دوسری تصویر بھی دکھا دوں گا مگر شام کو لشر طیکہ میں آؤں اور بیڈمنٹن کھیلنے کا وعدہ کروں۔

اسپر میں نے معاملہ صاف کرنا چاہا اور کہا۔ "خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں دوسری آپکی تصویر نہیں دیکھوں گی بلکہ جم کی دیکھوں گی۔ بولئے جم کی تصویر دکھائیے گا؟"

اسپر وہ بولے۔ "حجت کیوں کرتی ہو۔ کہدیا کہ دکھا دوں گا۔ دکھا دونگا۔ دوسری تصویر دکھا دونگا اور وعدہ کرتا ہوں کہ جو دکھائی ہے اس میں سینگ نہیں تھے اب ایسی دکھاؤں گا ایک تصویر جس میں سینگ بھی ہوں تاکہ تمھارا اطمینان تو ہو جائے۔"

میں صاف صاف وعدہ لینے پر تلی مگر اسے زینت نے گھبرا کر کہا کہ "خدا کے واسطے جان چھوڑ دو کہہ تو دیا دکھا دیں گے۔" بھی نے پھر کہا۔ "وعدہ کرتا ہوں .. اب خدا حافظ۔" یہ کہکر محبت سے ہاتھ ملایا اور اِس زور سے جھٹکا کہ معلوم ہوا کہ میرا شانہ اکھڑ گیا۔ اور تو میں نے کچھ نہ کہا مگر اپنا شانہ پکڑ کر کہا "صبر" بھی نے کہا "ان اللہ مع الصابرین ... خدا حافظ۔" یہ کہکر وہ چلے کہ ایک دم سے "ارے" کہکر رک گئے اور کہنے لگے "بحدائم تصور کو بیٹ رہی ہو بھولی لڑکی . . . . یہ کہکر آنکھیں کچھ نیم بار کر کے مجھ سے عجیب طرح سے کہا "تمہیں ایک چیز . "

یہ کہکر اپنا ٹرنک کھولا۔ اِدھر اُدھر کے کونے کُرید کر ایک رومال نکالکر اسی زور سے میرے مُنہ پر مارا کہ میں اوچھل سی پڑی۔ رومال میری عینک کی زنجیر میں آکر اٹک رہا۔ لیونڈر کی تیز خوشبو سے مہک رہا تھا۔ چھوٹا سا سفید رنگ کا مردانہ رومال تہا اور استعمال شدہ معلوم ہورہا تھا۔ "یہ کسکا ہے؟" نجمی نے مسکراکر مجھ سے پوچھا۔ "بخدا تم سونگھو اور پہچانو۔"

میرا خیال ایک دم سے کہاں سے کہاں پہونچا۔ اسکی بھینی بھینی خوشبو، عطر کی نہیں بلکہ حرم کی! معاً اس کے کونہ پر میری نظر پڑی۔ سُرخ رنگ سے اوس پر صرف "ح" "یعنی "حرم" کے نام کا پہلا حرف کڑھا ہوا تہا۔ میری عجیب حالت ہوگئی اور میں نے رومال اپنے ہاتھ میں لیکر کس شوق سے دیکھا۔ نجمی کھڑے مسکرا رہے تھے اور مجھے دیکھکر بولے۔ "بولو۔ بتاؤ کس کا ہے۔"

میری حالت وارفتگی کی سی تہی۔ میں نے کہا۔ "پہچان لیا۔"

"میرا ہے۔" نجمی نے ہنسکر کہا۔

"اس میں دھوکہ نہیں کہا سکتی۔ حرم کا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے آپ کا ہرگز نہیں۔"

"میرا ہے جی۔" مسکراکر نجمی نے کہا۔ "لاؤ اودھر۔"

مسکراکر میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ میں نہیں دیتی۔" اور یہ کہکر میں نے اُسکو اپنی آستین میں رکھ لیا۔

"اچھا خیر۔" نجمی نے کہا۔ "تو لو یہ کیسا تحفہ رہا۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا "شکریہ آپ کا۔"

مجھکو غور سے دیکھتے ہوئے نجمی برآمدہ میں چلے گئے اور تھوڑی دیر اس سے (ریت سے) لڑنے کے بعد چلی آئی کیونکہ اسی کمبخت نے شاہدہ والا مذاق اُنہیں بتایا تھا۔

(۲)

راستہ بھر میں حم کے رومال کو سونگھا کی۔ بخدا وہ رومال حم کا ہے اور اسے میں نے سونگھتے ہی پہچان لیا۔

"چل"۔ شاہدہ بولی "آئی وہاں سے باتیں بنانے والی۔ کسی چیتے سے تو اب اپنا پلو باندھ کیونکہ ناک تیری اللہ رکھے چینٹی کی سی ہے کہ رومال میں سنکر لگی تھی جو تو نے سونگھ لی۔ ایسی باتیں مجھے زہر ہی لگتی ہیں"۔

حم والی کو تو دیکھو۔ وہ صفا بگڑ کھڑی ہوئیں۔ اپنے شوہر کی لازوال محبت کا جو اثر اُن پر تھا اور اس کی وجہ سے جو روحانی ترقیاں ان میں رونما ہوئی تھیں او کا ما لتفصیل دعوٰے کر کے سمجھانے لگیں۔ اس کے جواب میں شاہدہ بولیں "بس تم تو خطوں کے ذریعہ سے نکاح ہوتے ہی فرشتہ اور پری ہو کر رہ گئیں۔ آج کسی کا رومال پا گئیں اُسے سونگھ کے پہچان لیا اور کہہ رہی ہو میرے میاں کا ہے کل کو تیری میری جوتی لے بھاگو گی اور سونگھ سانگھ کے کہو گی میں نہیں دیتی میرے میاں کی ہے"۔

اس پر شاہدہ سے حم والی کی خوب خوب چونچیں ہوئیں۔ بڑی مشکل سے شاہدہ کو اور حم والی دونوں کو چُپ کیا کچھ بھی ہو ان باتوں سے اُس سچی اور قابلِ رشک محبت کا پتہ چلتا تھا جو حم والی کو اپنے نادیدہ شوہر سے تھی وہ دراصل اپنے شوہر کی محبت میں فنا ہو کر رہ گئی تھیں اور اسی سلسلہ میں دراصل اونڈھی باتیں بھی کرتی تھیں مگر اس میں ان کی خطا نہ تھی بلکہ انکی پاک محبت کی۔ اس کے بعد پھر حم والی نے قصہ کا بقیہ دلچسپ حصہ بھی سُنانا شروع کیا۔

(۳۱)

حم والی بولیں "اے شام تک میں اسی رومال کو دیکھا اور سونگھا کی۔ . . "

"چینٹی کہیں کی" شاہدہ نے لقمہ دیا۔

" ہاں سونگھا کی" حم والی تن کر بولیں "تو کوں؟ . . " شاہدہ چُپ رہی تو حم والی بولیں۔

شام کو میں اماں جان سے با ضابطہ کہکر پہونچی جیسے ہی کمرہ کے سامنے پہونچی کیا دیکھتی ہوں کہ بجمی چائے پی رہے ہیں پیالی ہاتھ میں ہے میں نے کہا "سلام علیکم" انے بجائے سلام کا جواب دینے کے وہی چائے بھری پیالی اس زور سے پھینک کر مجھے ماری ہے کہ میں اگر ہٹ نہ جاؤں تو میرے منہ پر ہی پڑے۔ پیالی کمرہ کے دروازہ سے لگ کر کھیل کھیل ہو گئی اور چائے کے کچھ چھینٹے میرے اوپر بھی پڑے۔ میں نے ششدر ہو کر دیکھا اور کہا "یہ بھی کوئی بات ہے! میرے لگ جاتی تو"

اس کا ریت کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا اور مجھے بھی انکی مسخری سی صورت دیکھ کر ہنسی آئی بولے "بچائے پیو" حالانکہ ایک ہی پیالی تھی جو پھوڑ ماری تھی۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بولوں عجیب ہی معاملہ درپیش ہو گیا۔ وہ یہ کہ اتنے میں شامت کی ماری. . "ہنس کر حم والی نے شاہدہ کے زور سے چٹکی لی اور ریت نے ایک زور سے اسکی پیٹھ پر دھموکا دیا اور دونوں نے گویا ساتھ ہی ساتھ کہا "شامت کی ماری یہ بی شاہدہ آپہونچیں"

"کمبختو مجھے مارتی کیوں ہو؟" شاہدہ نے دونوں طرف حملہ کو روک کر کہا "اس مسخرے کی تم دیکھ لینا جو مجھ سری کی کوئی مل گئی تو جوتی سے ناک کاٹ لیگی"

حم والی بولیں "یہ تو بی برابر والے کمرہ میں کھڑی شستیشہ سے جھانک رہی تہیں دونوں آنکھیں ماتھا اور سر ان بی شتو کا انہوں نے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی بولے "ارے ایہ کون ہے . کون ہیں یہ ا . "

میں نے اور ریت نے ایک دم سے دیکھا اور یہ بی لپک سے چھپ گئیں۔

"کون ہیں یہ؟ بجمی نے ایک دم سے عجیب ہی شرارت سے آنکھیں جھپکا کر کہا "کون ہیں یہ؟ پکڑو انہیں"

"میں نے ہنس کر کہا" حم والی بولیں "ایک ہیں . سہیلی ہماری" اور ریت نے نام بتایا"

سر ہلا کر نجمی نے کہا "شاہدہ یعنی یہ کہ شیشہ میں سے مشاہدہ کرنے والی اچھا تو بُلاؤ انہیں ... کیسی صورت شکل ہے ان کی؟ . "نجمی نے رازدارانہ لہجہ میں کہا "کیسی شکل ہے؟ خوبصورت ہیں کچھ؟"

"اُچکا کہیں کا" شاہدہ بولی "وہ اس لائق تھوڑا ہی ہے کہ کوئی اُس کے سامنے رستے یا مُنہ بولے بھن بھائی کے بہانے سے آئے"

حم والی نے کہا "مجھے ہنسی آئی اور میں نے کہا کیوں نہیں اچھی خوبصورت ہیں" "لاؤ پھانس کے انہیں" نجمی نے کہا "تو لاؤ انہیں پھسلا کے جو خوبصورت ہیں تو لاؤ پھانس کے ."

شاہدہ بولی "وہیں سے ایسی جوتی دی ہوتی میں نے سسرے کے مُنہ پہ کہ یاد ہی کرتا کہ کسی اچھی سے مذاق کیا تھا.. سسرا کہیں کا. کھنڈیلا ہیں تو آیا وہاں سے پھانسنے اور پھنسوا لے اپنی اماں بہنا کو چھوڑ کر"

ہم سب کو شاہدہ کے غُصّہ پر سخت ہنسی آئی۔

حم والی نے کہا "یہ باتیں سُن کر میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ میں نے ایسی بدتمیزی کا ہیکوشی ہو گئی میں نے کہا "میرے جائیں دشمن میں کیوں کسی کو پھانس کے لانے لگی توبہ توبہ" میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں .."

"ہیں!" نجمی نے اپنے خوبصورت اور بشاش چہرہ کو پُرتکلّف سا کر کہا "کتنی بیوقوف اور سیدھی مگر خوبصورت لڑکی ہو۔ ارے لاؤ اُسے. جاؤ نعیم پہلے ہی سہی میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ان سے تعارف کراؤ" یہ کہہ کر مجھے اُنکے (شاہدہ) پاس بھیجا۔

بیٹھنے میں کھڑی کمحت ہنس رہی تھی۔ میں نے کہا "چل کمحت" تو بولی "نہ بہن میں نہیں جاؤنگی اس کے پاس یہ تو بڑا مُنہ پھٹ اور بیہودہ ہے۔ میں کیوں اِسکے سامنے آنے لگی" یہ کہہ کر

یہ تو سرک گئی اور ہیں ے آکر کہا کہ "وہ نہیں آتیں بھاگ گئیں"۔ تو یحیٰ نے کہا: "تم نے نکال دیا
خیر اس کی یہ سزا انہیں دیں گے کہ تصویر اپنی نہیں دکھائیں گے۔ اب آؤ بیڈمنٹن کھیلیں"
"میں نہیں کھیلتی" میں نے کہا "تاوقتیکہ آپ تصویر نہ دکھا دیں"
"تمہیں دکھائیں گے۔ کھیلنے کے بعد ہمارا وعدہ ہے"
"کھائیے قسم" میں ے کہا۔
"تمہارے سر کی قسم" یحیٰ نے کہا: "ایسی تصویر کہ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے یعنی
دو سینگوں والی"۔ یہ کہکر اپنے سر پر دو اُنگلیوں سے سینگ بنائے اور پھر کہا: "دو سینگوں والی
کیونکہ تمہارا خیال ہے کہ جب تک تصویر میں سینگ نہ ہوں تم حم کی مانوگی ہی نہیں"۔ یہ کہکر میرا
ہاتھ پکڑ کر باہر نکلے۔

(۴)

ہم تینوں کورٹ پر آئے۔ جال کی ڈوری یحیٰ ے اتنی تانی کہ ٹوٹ گئی۔ اس میں گرہ لگائی،
پھر اس کے بعد جال کا کھنبہ گرا دیا۔ اسے ٹھیک کیا تو ایک گیند کے سب تر لوچ ڈالے دوسری
گیند آئی اور ایک طرف مجھے اور ریست کو کھڑا کر کے دوسری طرف کھڑے ہو کر کھیل شروع کیا،
ایک دو سروس کے بعد ہی یحیٰ ے کھیل بگاڑ دیا۔ میں تو گیند چھونے ہی نہ پائی۔ گیند واپس
کرنے کو تڑپی تھی کہ اسقدر گھبرا کر چلاّئے کہ "ہیں ہیں ہیں تمہیں حم کی قسم"۔ میں رُک گئی۔ تیسری مرتبہ
جو یہ حرکت کی تو میں بلا پھینک کے الگ ہو گئی کہ "میں نہیں کھیلتی"
"میں بھی نہیں کھیلتا" یحیٰ نے کہا: "تاوقتیکہ چار کھیلنے والے نہ ہوں"
ساتھ ہی یحیٰ کی نظر پیچھے والے کمرہ پر پڑی جس کے دروازہ سے کھڑی بی بی ساہدہ پھر
جھانک رہی تھیں۔ ان کا جی گھبرا رہا تھا کہ اکیلی ہیں اور ہم دونوں باہر

نجمی نے بغیر دروازہ کی طرف دیکھے ہوئے کہا "کیا یہ نہیں کھیلنا چاہتیں ؟"
میں نے کہا "کیوں نہیں۔ خوب جانتی ہیں۔"
" تو پھر پکڑ و اسے " نجمی بولے " تم اسے ادھر سے ماتوں میں جاکر لگا ما اور پیچھے والے برآمدہ سے کمرہ کے پشت کے دروازہ ہی میں لیتا ہوں۔ دیکھو جانے نہ پائے "
یہ کہکر نجمی طاہرا باغ کی طرف چلدیئے اور اُدھر سے گھوم کر بائیں جانب کمرے کی پشت پر پھوپچے اور اب میں نے زینت سے کہا " ہں کیا سچ مچ شاہدہ کو پکڑ وادو گی "
یہ بولیں (زینت) " ضرور پکڑ واؤ مُردی کو "
" اسی کمبخت نے تو مجھے پکڑ لیا " یہ کہکر شاہدہ نے زینت کو ٹھوکا۔
جم والی نے ہنستے ہوئے کہا " پھر بہن وہ تو اُدھر گئے اور ادھر سے میں اور شاہدہ دونوں کمرہ کی طرف چلیں۔ برآمدہ میں دروازہ کے پاس جو ہم دونوں پہونچیں تو ان سے بی شاہدہ نے مُسکراکر دروازہ کھولا۔ ہم دونوں نے دروازہ میں قدم رکھا ہی تھا کہ بی شاہدہ ہنسوڑ ڈیبا رمانہ کی ہنس کے بولیں " لے بی وہ مسخرا کہاں گیا ؟ "
مارے ہنسی کے جم والی اور زینت دوہری ہوگئیں اور شاہدہ کو الگ مارنا شروع کیا۔
بڑی مُشکل سے ہنسی روک کر جم والی نے کہا " اِدھر تو شاہدہ بی نے ہنسکر یہ کہا کہ لے بی وہ مسخرہ کدھر گیا اور اُدھر دوسری طرف سے نجمی کمرہ میں گھُسکر کڑک کر کہا۔ " بندہ یہ حاضر ہے " بس بہن پھر تمہیں کیا بتاؤں کیا مزا آیا ہے۔ بھاگیں دہر کے یہ ہم دونوں کو بُری طرح دھکیل کے۔ مگر میں گلے میں ہاتھ ڈال کے ہسکولیٹ گئی اور زبردستی اس کو پکڑ لیا۔ گھیر کے یہ ماہر لائی گئی تاکہ کھیلے مگر یہ ایک طرآرہ۔ ۔ ۔ "
" بھدی برآمدہ ہی سے چھڑاکر یہ جا وہ جا " شاہدہ بولی " اور وہ مسخرا اپنا سا مُنہ لیکر رہ گیا۔

اری دوڑا تھا کمبخت میرے پیچھے اور میں گرتے گرتے بچی۔"

حم والی بولیں "ہیں یہ قصہ، جو ابھی کل ہی پیش آیا ہو اور جسے سُنانے کو تڑپ رہی تھی۔"

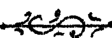
"ایلو"، شاہدہ بولی "ہیں اصل بات تو قصہ کی یہ چُھپا رہی ہیں۔ اِنہیں اُس مسخرے نے اِنکے حم کی اصلی تصویر دیدی اور وہ اب میرے پاس ہے۔"

اسی پر حم والی کو خوب ہی بنایا۔ میں پوچھوں تو وہ بتائیں نہیں۔ کہنے لگیں "وہ تو مسخرے ہیں، کسی اخبار کی تصویر پھاڑ رکھی تھی، وہ مجھے دکھا دی" مگر شاہدہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ انہوں نے وہ تصویر کھسوٹ کر گولی بنا کر پھینک دی تھی اور شاہدہ اسے ڈھونڈھ کے اُٹھا لائی تھی، لپک کے وہ کاغذ کی ایک گولی نکال لائی۔ حم والی جھپٹے لیکن میں نے کہا "نہیں میں ضرور دیکھوں گی"۔ میں نے دیکھی۔ مارے ہنسی کے میرا بُرا حال ہو گیا۔ ایک بکرے کی تصویر تھی۔ کسی اخبار کی۔ اس کے بڑے بڑے سینگ روشنائی سے بنے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بنی سی ہوئی تھی اور ایک آنکھ اس کی پھوڑ دی تھی نیچے لکھا ہوا تھا "حم"۔



یہ مزیدار قصہ سُنکر میں واپس ہوئی۔ حم والی کے ساتھ میں اور زینت۔ راستہ میں حم والی نے خوشامد کر کر کے زینت سے کہا کہ "بہن تصویر ہو تو پتہ لگانا"۔ زینت نے پیشتر ہی کہدیا تھا کہ "میں نے ٹرنک کا کونہ کونہ دیکھ مارا کوئی دوسری تصویر ہی نہیں"۔ مگر وعدہ کیا کہ پھر دیکھوں گی۔

میں گھر پر پہنچی تو مولانا کو اپنے لئے بیچین پایا۔



باب ۶

ہنڈیا میں نمک پھیکا

(۱)

"ہنڈیا میں نمک پھیکا" زور سے شاہدہ نے کہا "گلونی" شاہدہ نے پھر کہا اور ایک آواز اور دی۔ "ہنڈیا میں نمک پھیکا" اب میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ سانولی رنگ کی بھولی بھالی صورت والی جنکے چہرہ پر بجد نمک اور نکھار تھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں پیام مسرت لئے اور ہونٹوں پر تبسم آمیز لرزش آہستہ سے ہماری طرف بڑھیں۔

"سلام علیکم" انہوں نے تکلفانہ تبسم اور آہستگی سے شاہدہ کی طرف مڑ جاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب دیا۔ شاہدہ نے قصداً اپنے کو ایک اور سہری سے باتیں کرنے میں مشغول کرنا چاہتی تھیں۔

میں نے تعجب سے خاتون کے بشاش چہرہ کو دیکھا۔ وہی خاتون جو کمہلاتے ہوئے پھول کی طرح مجھ سے ملنے آئی تھیں اور جنکے نالائق شوہر نے انکے لئے جہنم مہیا کر رکھی تھی۔ پچھلی مرتبہ مجھ سے ملی تھیں تب انکا کیا حال تھا اور آج؟ آج تو انکے خوبصورت چہرہ پر نور کی کھلیاں چمک رہی تھیں۔

شاہدہ کی طرف انہوں نے ایک دم سے اپنی شربتی آنکھوں میں سرور پیدا کر کے دیکھا۔

وہ شاہدہ کے سر پر ہی کہڑی تہیں " مسخری کہیں کی" اُنھوں نے عجیب لہجہ میں کہا اور میرے دیکھتے دیکھتے اُنھوں نے ایک دم سے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے سے بی شاہدہ کے گلے میں محبت سے حمائل کر دیئے اور کندھے پر سر رکھکر شاہدہ کو ٹھوڑی پکڑ کر ہلا مارا۔

"اونہہ" شاہدہ نے جھٹکا دے کر کہا " دیوانی ہوئی ہے لڑکی . . . چھوڑ . . . مجھے" یہ کہکر شاہدہ نے اپنے کو چھڑایا. وہ گھوم کر شاہدہ کے سامنے آگئیں۔

"گھور کیسی رہی ہے گول دڈی . . . " شاہدہ نے خاتون کی خوبصورت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

نہایت ہی شوریدہ سری سے گویا اپنی تمام روایاتِ غم واندوہ کو فراموش کر کے بی خاتون بولیں :۔

" میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ آج تمہاری دہج کیا ہے ! یہ سُوجھی کیا ہے "

"سُوجھی کیا ہے!" شاہدہ نے سادگی سے کہا۔ انکی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف اور پھر اپنے حلیہ کی طرف دیکھکر ہنس دی۔

" مسخری کہیں کی" خاتون بی نے کہا " نت نئے ڈھونگ رچانے آتے ہیں تجھے" بات دراصل یہ تھی کہ یہ شہر کی شادی کی ایک محفل تہی اور اپنی وضع قطع چھوڑ کر شاہدہ پُرانی وضع کے کپڑے پہن کر آئی۔ پھر زیور بھی اس قسم کا جو صحیح معنی میں "گہنا پاتا" کہلانے کا مستحق ہے۔ نمعلوم کس سے مانگ لائی تہی۔ شاید دیدہ و دانستہ اس سج دہج پر سرمہ ایسا لگایا تہا کہ پھیل کر رہ گیا تھا اور پھر پان پہ پان اسقدر کہاتے تھے کہ سارا مُنہ لال تہا۔

" میری دہج کو تو جانے دو" شاہدہ نے خاتون بی سے کہا " اپنی کہو تو بی یہ تمہاری آنکھوں میں آج پریاں کیسے ناچ رہی ہیں ؟"

شاہدہ کا سوال صحیح بھی تھا کیونکہ بی خاتون کے چہرہ پر آج بجائے محرم کے عید کا اکھاڑہ جما ہوا تھا۔
بی خاتون اِس سوال سے اور بھی جگمگا اوٹھیں۔ ایک مسکراہٹ کا پھول لگے چہرہ پر کھلکر
رہ گیا جو اونکے حالات کو جانتا تھا وہ اسکے ایک ہی معنیٰ لے سکتا تھا۔ چنانچہ شاہدہ نے بھی وہی
معنیٰ لئے اور بولی۔

"معلوم ہوتا ہے اور کچھ روپیہ تمھارے ماوا نے تمھارے نام کر دیا ہے؟"

بات در اصل یہ تھی کہ جب خاتون بی کے سوہرے اُس سے روپیہ لیا تھا تو یہ کچھ دن تک اپنے
میاں کو روپیہ دیکر خواہ مخواہ خوش ہوتی پھری تھیں، میری طرف شاہدہ منہ کرکے بولی۔

"اس سے بھی زیادہ احمق کون عورت ہوگی۔ اُٹھایا اور میاں کو رنڈی بازی کیلئے روپیہ دیدیا"

"تو کون؟" ہنسکر خاتون بی نے ڈانٹا۔ "اچھی دیدیا ہم نے۔ اپنا میاں تھا دیدیا کسی غیر کو تو
نہیں دیدیا؟"

"غیر کو دیا ہوتا، تو پھر لاکھ درجہ اچھا تھا" شاہدہ کچھ سنجیدگی سے بولی "پچھتاتی تو ہوگی
اپنی حماقت پر؟"

ایک دم سے بی خاتون سنجیدہ اور کچھ خوف زدہ سی ہو کر بولیں "خدا گواہ ہے کہ ذرہ بھر جو
رنج ہوا کبھی جو پچھتائی ہوں! کبھی جو خیال آیا ہو! بلکہ طبیعت اور خوش ہوتی ہے"

"جہنم میں جائے ایسی طبیعت" شاہدہ نے کہا۔ "یوں ہی تو ہوئیں بربادیاں ہوگئیں"
بی خاتون کچھ بولنے ہی کو تھیں کہ کسی نے ان سے آکر کہا کہ تمہاری ساس بلا رہی ہیں' "ارے" کہکر
وہ اٹھیں جیسے کچھ بھول گئی تھیں۔ "ابھی آئی" یہ کہکر وہ ہوا ہو گئیں۔



"دیکھا تم نے اِن لوگوں کو" بی شاہدہ بولیں۔ "دیکھا تم نے! یہ سب باتیں اور پھر ان کی یہ

حرکت انہ بابا۔ مجھ سے ایسے لوگوں سے کیسے سے گی۔ کون لڑکی ایسوں میں جانا پسند کریگی؟ اس سے ذرا پوچھو تو۔ آج انہیں اچھی طرح جھاڑ دوں گی۔"

بات در اصل یہ تھی کہ بی خاتون اپنے بھائی ابوالحسن صاحب کی شادی شاہدہ کیساتھ کرانا چاہتی تھیں۔ یہ بہت پرانا معاملہ تھا۔ میرے آنے سے بہت پہلے کا۔ شاہدہ کی نسبت دوسری جگہ پکی ہو جانے سے معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔ اب بی شاہدہ کے پٹواری کے مرنے کے بعد بی خاتون اور اُن کی والدہ صاحبہ بلکہ اصل میں خاتون ہی پھر اس معاملہ کو چھیڑ رہی تھیں۔

میں نے شاہدہ سے کہا کہ خاتون کے میاں سے اور بھائی سے کیا تعلق۔ خاتون کے میاں غیر مہذب لٹھ تھے لیکن بھائی تعلیم یافتہ اور ہونہار نوجوان تھے۔ اس پر شاہدہ بولیں کہ "بہن تم جانتی نہیں ہو وہ بھی پرلے درجہ کے احمق اور زشت دماغ ہیں۔ پھر صورت شکل غلاموں کی سی ہے"

اس کے بعد پھر اسی پر باتیں ہوئیں کہ آخر بی خاتون آج اسقدر خوش کیوں ہیں؟ کیا معاملہ ہے؟ دریافت کرنا چاہئے۔ شاہدہ کا خیال تھا کہ انکے میاں نے زیادہ سے زیادہ گھر میں سے ان کی معرفت جوتا سلوا لیا ہوگا یا پھر قمیص میں بٹن ٹنکوا لیا ہوگا۔ بس بی خاتون اسی میں خوش ہو جاتی ہیں۔

"اپنے میاں کو بیحد چاہتی ہے بیچاری" میں نے ہمدردی سے کہا۔

"چاہتی تو واقعی بیحد ہے" بی شاہدہ بھی پسیج کر بولیں "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے بدمعاش اور موذی شوہر سے کیسے انہیں اتنی محبت ہے۔ میرا بس چلے تو ایسے کو پھانسی دلوا دوں"

"کسے؟" ایک دم سے پیچھے سے خاتون بولیں "یہ کسے پھانسیاں مل رہی ہیں؟ یہ کس غریب پر ظلم ہو رہا ہے؟"

شاہدہ نے اور میں نے مڑ کر دیکھا شاہدہ چپ سی ہوگئی۔ مگر بی خاتون تو آج گلاب کے پھول کو مات کر رہی تھیں۔ خاک کے تودے میں سے مسرت کے شرارے نکل رہے تھے۔ ادھر شاہدہ گھبرا سی گئی کہ کہیں خاتون نے پوری بات تو نہیں سن لی اور ادھر خاتون نے اسی لہجہ میں شاہدہ کی گردن میں ہاتھ ڈالکر چپکے سے کہا۔ "کیسے پھانسیاں مل رہی ہیں۔ کیسے گھایل کر رہی ہو بھابی جان"

"چل" مگڑکر شاہدہ نے جھٹکا دیا۔ "بیہودہ نہیں تو۔ کلوٹی کہیں کی۔ . . پھر وہی بدتمیریاں . . . بیہودہ"

یہ کہکر شاہدہ نے ٹیڑھی ٹیڑھی آنکھوں سے خاتون کو دیکھا

خاتون کو یہ کچھ برا سا لگا۔ مگر انھوں نے شاہدہ کے غصہ بھرے چہرہ کو غور سے دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولیں۔

"اوہو . اتنی بگڑتی ہیں! . . . . ."

جی ہاں" شاہدہ نے کہا: "مجھے معلوم ہے۔ سب معلوم ہے مجھے . پھر وہی حماقت ہو رہی ہے . . . . میں مذاق نہیں کرتی خاتون بی۔ یہ اچھی بات نہیں ہے' اچھا نہیں ہے' . . . خوب سمجھ لو"

"خوب سمجھ لیا ہے" بی خاتون بولیں ہنستی ہوئی۔ "خوب سمجھ لیا ہے"

شاہدہ نے زہریلی نظروں سے دیکھکر خاتون سے کہا: "مجھے تمہارے گھرانے سے اور ڈھنگوں سے نفرت ہے"

بی خاتون نے یہ اہانت آمیز حملہ گویا سر آنکھوں پر لیا۔ در احقانہ ہوئیں مگر ذرا طنزیہ لہجہ میں بولیں۔

"سبحان اللہ" ! دنیا جہان سے تمہیں نفرت ہے یہ مزاج اپھر ہیں تمہارے لئے کوئی فرشتہ

تو آسمان سے اترنے سے رہا کیا کسی فرشتہ سے کروگی" یہ کہکر بی خاتون نے ایک مصنوعی ہنسی کے ساتھ کندھا پکڑکر شاہدہ سے پھر پوچھا "کیا کسی فرشتہ سے شادی کروگی ؟" اور تیز ہو کر شاہدہ بولی " فرشتوں سے نہیں تو پھر چل کوؤں سے ہی نہیں کرونگی۔ تم قارون کی بیٹی ہو تو ہوا کرو اور ہم غریب ہیں تو کیا ہوا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ اللہ رکھے آوا کا آوا ہی بگڑا ہے۔ اونٹ کی کون کل سیدھی ۔ ۔ ۔ ۔ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل، وہ مضمون بی تمہارا ہے کہ چلیں وہاں سے بی مینڈکی جان کہ ہمارے بھی نعل ٹھونک دیا"

یہ سخت و سست باتیں سنکر شاید بی خاتون کے جذبات کو کچھ ٹھیس لگی اُنہوں نے کچھ پژمردہ ہو کر کہا "بہن تم تو بگڑ گئیں "

"بگڑنے کی بات ہی ہے بہن"۔ شاہدہ سنجیدگی سے بولی " تم ہی انصاف کرو کہ پہلے تھا تو میں تمہاری خوشامد کر چکی تھی اور اب پھر ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مگر تم ہو کہ مانتی ہی نہیں ہو، سر پیر کا زور لگا رہی ہو ۔ ۔ اچھا کھاؤ قسم ۔ ۔ اپنے بھائی کے سر کی قسم کہ پھر وہی حرکت نہیں کررہی ہو۔"

خاتون بولیں کہ "پھر کوئی گناہ تو ہے نہیں۔ میں کیوں جھوٹی قسم کھاؤں ہاں کررہی ہوں"

"تمہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے"

"یہ کیسے ممکن ہے ؟" بی خاتون بولیں "بغیر تمہارے میرے بھائی کی زندگی تلخ ہو جائیگی اور ۔ "

"مت بیہودہ بکو" بگڑ کر شاہدہ بولیں "مہربانی کرکے آپ مجھ سے دُور رہیں میں نہیں بولتی آپ سے "

کس حسرت سے بی خاتون نے شاہدہ کے خوبصورت چہرہ کو دیکھا ہے اور کس خوشامد سے اُنہوں نے کہا ہے کہ بیان سے باہر۔ کہنے لگیں "میری بہن ۔ ۔ میری شاہدہ ۔ ۔ ۔ خدا

کے لئے۔۔۔۔"

یہ کہکر شاہدہ کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور بڑی محبت سے بولیں "تو مجھ سے خفا ہو گئی" یہ کہکر اپنا سر شاہدہ کے کندھے پر محبت سے رکھدیا۔ "تو مجھ سے خفا ہو گئی" انہوں نے پھر درد آمیز لہجہ میں کہا۔

"مجھے یہ چوچلے نہیں آتے ہیں" شاہدہ نے بھویں سکیڑ کر اپنے کو چھڑاتے ہوئے کہا "میں خفا وفا بالکل نہیں۔ مگر تم یہ بیہودہ باتیں چھوڑ دو"

کس محبت سے خاتون بی شاہدہ کے غصہ اور خفگی کو برداشت کر رہی تھیں اور کیوں نہ ہو کہ اپنے بھائی کیطرف سے شاہدہ کی عاشق زار تھیں۔ مجھے مخاطب کر کے بولیں۔

"دیکھتی ہو اس شوخ کو جانتی ہے کہ ایک شخص کس طرح اس سے شادی کرنے پر مٹا ہوا ہے۔ اور پھر یہ بھی خوب جانتی ہے کہ بیس ہزار کا نقد مہر ادا ہو گا۔ ایک کوٹھی مع دکھائی میں ملیگی۔ موٹر سواری کو اور شوہر تعلیم یافتہ۔ ہزار جاں سے چاہنے والا۔ سر آنکھوں پر بٹھائیگا اور پھر۔"

شاہدہ جلکر بولی "ایک تمہیں لوگ سر پہ رکھے پھر رہے ہیں اور ایک مجھے سر پہ رکھیں گے اور رہا تمہارا روپیہ تو بہن یہی تو مغالطہ ہے تمہیں۔۔۔" سہلا کر شاہدہ بولی "کہ روپیہ کے زور سے اپنے سب کچھ کرا لو گی۔ باجی نا۔ نہ تو مجھے نقد مہر چاہئے اور نہ چاہئے مجھے کوٹھی اور کوٹھا۔ تم جاؤ اور کسی پری سے اپنے بھائی کی شادی کرالاؤ مگر خدا کے واسطے مجھ غریب کو بخشو۔ رحم کرو۔ کہنیوں تک ہاتھ جوڑتی ہوں۔" "پری ہی سے کرونگی! پری سے۔۔ ۔۔ پریوں کی پری سے۔" انگلی سے بی شاہدہ کو چھیڑ کر خاتون بولیں۔ اور اٹھتے اٹھتے چھیڑتی گئیں "بھائی جاں!" آنکھیں خوشی سے پُر نور کر کے اور شرارت آمیز مسکراہٹ سے چھیڑتے ہوئے انہوں نے شاہدہ کی طرف انگلی جھٹک کر کہا "پری سے کرونگی" یہ کہکر وہ پھر غائب ہو گئیں۔

شاہدہ کٹ کٹ کے بُرا کہہ رہی تھی۔ ہم دونوں کھانے کے لئے اٹھیں۔ شاہدہ نے مجھ سے کہا کہ "ذرا پتہ تو لگانا یہ خاتون بی اسقدر خوش آج کیسی ہیں"۔

کھانا ختم ہو گیا تو مجھے بی خاتون سے باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ خوش تھیں اور بیحد خوش رہیں مے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ وجہ بھی خوشی کی عجیب وغریب ہے۔ یعنی یہ کہ اسکے میاں نے اپنی رنڈی کے لئے ان سے کھانا پکوالیا۔ میں نے ان کے بشاش چہرہ کو دیکھا کس طرح یہ اپنے آوارہ اور بدقماش میاں کو چاہتی تھیں؟ انکے اوس محبت آمیز لہجہ سے اُس حقیقی عشق کا پتہ چلتا تھا جو انکو ایسے نالایق شوہر سے تھا کس انداز سے اُنھوں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ "بہن۔ لاکھ دلکو سمجھاتی ہوں جی چاہتا ہے کہ نفرت ہو جائے۔ بگڑ جاتی ہوں۔ تہیہ کر لیتی ہوں دل میں کہ اب کوئی سروکار نہ رکھونگی۔ مگر جہاں صورت دیکھی بس رونا سا آجاتا ہے"۔ یہ کہتے کہتے ایک دم سے اون کی آنکھیں ڈُبڈُبا آئیں۔ فوراً اُنھوں نے منہ پونچھکر پھر وہی بشاش چہرہ بنالیا۔ کس قدر خوش تھیں محض اس نامعقول وجہ سے۔

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے بھائی کی باتیں شروع کیں۔ گویا پروپیگنڈا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو اون کی لیاقت۔ ذہانت اور ہونہاری پر ایک لکچر دیا۔ پھر یہ بتایا کہ کس طرح وہ شاہدہ کے نادیدہ عاشق ہو گئے۔ شاہدہ کی باتیں، شاہدہ کی دلچسپ شرارتیں۔ اور اُس کے گانے کی مہارت کا ذکر اپنی بہن کی زبانی سنتے رہے۔ آخرش شاہدہ پر اُن کو اس طرح عاشق ہونا پڑا کہ شادی کا پیغام دیا۔ پھر اس شادی کی دُھن ایسی حماقتیں ملاحظہ ہوں۔ خاتون کی زبانی معلوم ہوا کہ کہیں شاہدہ پیانو کے لئے بیتاب رہتی ہیں۔ بیحد شوق ہے کہ کہیں سے پیانو میسر ہو۔ اِسکا علاج اُنھوں نے یہ سوچا کہ بغل میں پیانو کی فہرست دبائے پھرتے ہیں یہ بہت بیشتر کی باتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب شاہدہ کے پٹواری

کے مرنے پر کیا کچھ باسی کڑھی میں اُبال نہ آرہا ہوگا۔ کہاں تو بی خاتون الگ تھلگ اپنے غم میں ایک کونے میں مکڑی کی طرح منہ دیئے پڑی رہتی تھیں اور اب ذرا سے بہانہ پر بھائی کی شادی طے کرنے کے لیئے تمام رنج و غم کو چھوڑ کر پروپیگنڈا کرنے اُٹھ کھڑی ہوئیں مجھے تمام اونچ نیچ سمجھانے لگیں اور اچھی طرح سمجھایا کہ اُنکے میاں کی عادتوں سے اُنکے بھائی کو کوئی تعلق نہیں۔ پھر شاہدہ کی بہتری کے لئے مجھ سے کہا کہ شاہدہ کو اچھی طرح سمجھانا اور راضی کرنا۔ میں سب کچھ سنتی رہی اور وعدہ بھی کیا کہ تمہارے بھائی کے لئے کوشش کرونگی۔ پھر کچھ اُنکے میاں کے بارے میں پوچھا چاہا تو ذرا ان کو تامل سا ہوا تو میں نے قصہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ میں نے بھی دل میں کہا کہ آدمی کو خوشی چاہئے وہ خواہ کسی وجہ سے ہو۔ میں خوش تھی کہ خاتون بی خوش ہیں

اس کے بعد پھر شاہدہ سے خاتون کی ملاقات ہوئی۔ شاہدہ نے میری زبانی جو اُنکی باتیں سنیں تو اور بھی اُن کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا۔

"نہ بہن مجھ سے رنڈیوں کے لئے کھانے نہیں پکیں گے۔ تم اپنے بھائی کے لئے کوئی زرخرید منگوالو۔ تمہاری بھابی جان تمہارا ہی ہاتھ بٹالیا کریں گی" غرض اسی قسم کے فقرے شاہدہ نے خوب خاتون کو سنائے۔ مگر بی خاتون کا یہ حال کہ شاہدہ کی ہر بدتمیزی کو خوش فعلی اور زندہ دلی قرار دیکر پھڑک اُٹھتیں۔ بجائے خفا ہونے کے وہ خوشی سے کھل گئیں اور چلتے چلتے شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر بولیں "بہن تم چاہو کہ اِن باتوں سے میری محبت جاتی رہے تو یہ ناممکن۔ میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑونگی اور تمہیں بھابی جان بنا کے رہوں گی"

"چل" شاہدہ نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "ہوش میں آتی ہے کہ نہیں۔ آئی وہاں سے بھائی کی چہیتی۔ مجھ سے آج سے بات ہی کی ہو تو تم جانو"

بی خاتون نے مسکراتے ہوئے عجیب انداز سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔ شاہدہ آگے بڑھی تو مجھ سے مسکرا کر انہوں نے کہا۔ "چراغ لیکے ڈھونڈتا ہے بہن میں نے لے اسے۔ اسے چھوڑوں گی تھوڑی۔ کہہ دینا تم "
اس طرح گویا بی خاتون نے جہاد کا علم کھلم کھلا بلند کر دیا۔

باب
گلاب جامن

گلاب جامن بہی عجیب مٹھائی ہے۔ بشرطیکہ اچھی بنی ہو۔ خراب گلاب جامنیں تو وہ ہوتی ہیں جو دیکھنے میں تو سرخ اور اچھی ہوتی ہیں مگر اندر سے سخت اور ٹھوس۔ بلکہ اکثر ایسی کہ اندر سے خشک قوام تک جذب نہیں ہوتا۔ دوسری وہ جو بڑی بڑی نہایت ہی سُرخ دیکھنے میں۔ ملایم ایسی کہ شیرہ میں ڈالی جاتی ہیں تو رگ رگ میں انکی شہد سا بیٹھ جاتا ہے۔ اندر تک ریشہ ریشہ میں حلاوت اور شیرینی پیوست ہو کر رہ جاتی ہے یہ اسقدر مُلایم ہوتی ہیں کہ بیان سے باہر۔ نہایت ہی شیریں نہایت ہی خوش ذائقہ ایسی کہ بس روح خوش ہو جائے یہاں ایسی ہی ایک بڑی سی گلاب جامن کا ذکر ہے جو نہایت ہی رسیلی میٹھی۔ اور انتہا سے زیادہ مُلایم تہی۔

اتنا کچھ تو گلاب جامنوں کے بارہ میں۔ اب ذرا بی شاہدہ کے چھوٹے ماموں کی شادی کے دلچسپ۔ ... بلکہ ضروری حالات سُنئے۔

شاہدہ کا ساتھ! ریل کا سفر! آزادی اور شرارتیں اور بدتمیز ماں! مگر یہاں تو صرف ایک انتہا سے زیادہ مُلایم گلاب جامن ہی کا قصہ ہے

(۱)

اسٹیشن قریب آرہا تھا اور گاڑی کی رفتار ہلکی ہوتے ہی ہم سب میں کھلبلی سی پڑ گئی۔

حالہ جان نے کہا کہ "لڑکیوں خدا کے واسطے اب تو برقع یہن لو"۔ کیونکہ خدا کے فضل سے ہم دونوں نے اپنے اپنے برقعے اُتار کر رکھ دئیے تھے اور راستہ بھر تعلیم یافتہ اور شریف مسافروں کے تیز نگاہ کا نشانہ سما نہایت ہی لاپرواہی سے منظور کیا تھا۔

جلدی جلدی ہم دونوں نے برقعے پہنے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی۔ میں نے اور شاہدہ نے جھانک کر باہر دیکھا۔ گاڑی رُکی اور شاہدہ کے بڑے ماموں صاحب دوڑ کر ہم لوگوں کی گاڑی کے پاس آئے۔ قلیوں اور مسافروں کی چیخ پکار اور ہم براتوں کی گھبراہٹ اور اندھا دُھند دیکھنے کے قابل تھی۔ جلدی جلدی اسباب اُترنے لگا شاہدہ کے ساتھ ہی میں بھی اُتری۔ ماموں صاحب نے پلیٹ فارم کی دیوار کی طرف اُنگلی اُٹھا کر کہا کہ ویٹنگ روم میں چلی جاؤ۔ شاہدہ کے ساتھ ساتھ میں بھی اُدھر ہی تیزی سے بڑھی۔ بہت جلد ہم دونوں داہنی طرف بہک گئیں۔

یہاں میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ نہ تو مجھ میں وہ تیزی ہے جو شاہدہ میں اور نہ میری وہ ہمت ہے جو شاہدہ کی اور نہ میں اتنی بیباک یا نڈر ہوں جتنی کہ شاہدہ اور نہ پھرتی شریر "اری کمبخت یہ دیکھ اس کو"۔ شاہدہ نے ایک بڑے موٹے اور زبردست لالہ جی کی طرف اشارہ کیا جو ایک خوفناک گینڈے کی طرح اِدھر ہی لُڑھکے چلے آ رہے تھے۔ میں نے اُنہیں غور سے دیکھا میں نے اِس قدر بھدا اور موٹا آدمی کبھی نہ دیکھا تھا۔ بس اُنہیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں وہ برابر آ گئے اور میں رُک گئی کہ وہ نکل جائیں جیسے ہی وہ موقعہ سے قریب آتے ہیں کہ اِس کمبخت شاہدہ نے برابر سے مجھے ایسا چپکے سے دھکیلا کہ میں ہاتھ سے نقاب چھوڑ کر لالہ کے اوپر گری۔ کیسی میں علیحدہ ہوتی ہوں کہ بیان سے باہر اور اسقدر بدحواسی کے ساتھ کہ ایک اور کسی سے لڑ گئی اور کترا کر بال بال بچی ورنہ ٹھیلہ سے میرے بڑی سخت چوٹ لگتی۔

میرے ہوش جاتے سے رہے اور میں نے لگڑ کر کہا شاہدہ سے "کمبخت۔ خدا تمہیں

سمجھے۔ بھلا یہ کونسا مذاق ہے۔ غضب کرتی ہو۔ مجھے یہ بیہودگی پسند نہیں ہے۔"

اِدہر میرا تو یہ حال اور اُدہر بی شاہدہ ہنسی کے مارے پھولی برقعہ میں سماتی تھیں، وہ ہنسی کے مارے بیحال ہو رہی تھی۔ "کیسا میں نے نرم نرم گدے پر ڈھکیلا ہے۔" یہ کہکر وہ ہنسی کے مارے بیتاب ہوئی جا رہی تھی۔ میں اس کے برابر آگئی۔ ہم دونوں دیوار کے پاس ہی تھیں اور سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ویٹنگ روم کا کونسا دروازہ ہے۔ "یہ یا وہ" "وہ ہے۔" شاہدہ نے کہا۔ میں اس کے برابر تھی اور میں نے سمجھا کر شاہدہ سے کہا "ہن اِس قسم کا مذاق بڑی بے شرمی اور بیہودگی ہے۔ یہ کوئی تمیز نہیں۔ بھلا کوئی دیکھے گا تو کیا کہیگا!"

میں یہ لیکچر دیتی ہوئی ویٹنگ روم کے دروازہ کے پاس ہی پہونچی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ ریل پیل سے ایک بھڑ کیلے نوجوان۔ کچھ جاذب نگاہ ٹیڑی ترچھی مانگ نکالے۔ کچھ طالب علمانہ دہج سے فاختئی رنگ کی شیروانی پہنے۔ ٹوپی ہاتھ میں لئے۔ بدحواسی چہرہ پر تحریر لو کہلائے چلے آرہے ہیں۔ شاہدہ کی بائیں جانب کو۔ جیسے کہ یہ بھی ویٹنگ روم میں جانا چاہتے ہیں۔ معًا مجھے خیال آیا کہ مردانہ ویٹنگ روم تو نہیں میں نے برقعہ کے اندر ہی جالی میں سے دیکھا اور شاہدہ سے چپکے سے کہا کہ "یہ تو مردانہ ہے۔" اِدہر شاہدہ مڑی اور یہ حضرت نہایت ہی احترام کے ساتھ گویا ہم لوگوں کی وجہ سے اپنی تیزی میں رُک گئے اور چاہا کہ ہم دونوں نکل جائیں۔ میری عقل تو دیکھو کہاں تو اس بیہودگی پر شاہدہ کو ڈانٹ رہی تھی اور کہاں میں نے جو موقعہ دیکھا تو کہنی جو ایسی شاہدہ سے بھڑ کے لگائی ہے تو بی شاہدہ ان جنٹلمین پر وار دا اور وہ بھی اس طرح کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکے یعنی یہ کہ ہاتھ سے نقاب تو گرا ہے ہی نہیں، لگا جو میری کہنی کا زور سے دھکا تو اِدہر تو بیچارے ڈگمگائے اور اُدہر ہاتھوں کا توازن بگڑا نتیجہ یہ کہ برقعہ کی ٹوپی ہاتھ کے ساتھ معہ نقاب کے کھسکر شانہ پر پہونچی اور چاند سا مکھڑا سامنے۔ اور پھر کھلے بندوں پلیٹ فارم پر زبردستی ان حضرت

سے عید ملنا پڑی۔

ان حضرت کو بھلا یہ بے موقع عید کب گوارا تھی اور پھر وہ بھی کھلے بندوں اسٹیشن پر نتیجہ یہ کہ یہ گلے ملنا انہیں اسقدر ناپسند آیا کہ اس بُری طرح انہوں نے تو کہلا کر شاہدہ کو الگ پھینکا ہے کہ بیان سے باہر۔ بی شاہدہ تو گھٹنوں کے بل آئیں اور یہ حضرت ٹوپی جھٹک کر یہ جا وہ جا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ اسٹیشن پر یہ شرارت کس خوبی سے ممکن ہے۔ کوئی معلوم ہی نہیں کر سکتا کہ کیا مصیبت آئی۔ اوّل تو ہر کس و ناکس اپنے وبال میں پھنسا ہوتا ہے۔ پھر اس صفائی سے دھکا دیا جانا ممکن ہے کہ کسی کو تمیز تک ہو سکے کہ شرارت تھی یا اتفاق۔

میں زنانہ ویٹنگ روم کے دروازہ کے پاس پہونچی تھی۔ اب میرا بھی وہی حال تھا جو کہ بی شاہدہ کا میں ہنس رہی تھی وہ سُلگ رہی تھی۔

"کہو بی" میں نے کہا۔ "اور شرارت کرو گی؟"

"رہ جا" شاہدہ بولی۔ "نہ تجھے ایک کسی ڈھیٹ پر دھکیلا ہو" ہنس کے بولی شاہدہ "سوچتا تو ہوگا یہ کون کمبختنیں ہیں۔ . . اری ! اور وہ تیرا میا! وہ کیا سوچتا ہوگا دل میں؟ یہی کہتا ہوگا کہ فال اچھی ہے صبح صبح ایک خوبصورت چھوکری آ کے توند سے لپٹ گئی تیری قسمت اچھی تھی کہ وہ ڈھما کا ڈھما تھا۔ ہلا جلا دو پہر تھا ورنہ تو بھی گرتی۔"

میں نے کہا "مجھے تو میرے سے نئے بچارے نے دیکھا تک کا نہیں مگر ہاں یہ تیرا والا البتہ کہتا ہوگا کہ اچھی کا منہ دیکھا۔"

"کمبخت نے کیسا اٹھا کے پھینکا ہے مجھے" شاہدہ بولی۔ "میرا گھٹنا ٹوٹ گیا جلن ہو رہی ہے" برابر سے خالہ جان اور بڑی خالہ بھی آ گئیں اور ہم سب کی سب ویٹنگ روم میں داخل ہوئیں

ویٹنگ رُوم کے دروازہ پر موٹریں آکر لگ رہی تہیں میں نے اور شاہدہ نے صلاح کی کہ کسی ایسی موٹر میں بیٹھیں جس میں کوئی بڑی بوڑہی نہ آسکے۔ تیسرے نمبر پر چھوٹی موٹر لگی تہی میں نے شاہدہ کو جلدی سے اشارہ کیا اور ہم دونوں جھٹ سے اسی میں بیٹھ گئیں، صرف دو کی جگہ تہی اور اطمینان تہا کہ اب کوئی اس میں نہ آئے گا۔ اس موٹر میں صرف دو چھوٹے چھوٹے مونڈھے تھے اور سفید چادروں کے پردے اچھی طرح بندھے ہوئے تھے۔ بہت جلد موٹر کا ڈرائیور آگیا ایک اور کوئی آیا۔ دونوں میں آپس میں باتیں ہوئیں۔ یہ طے ہوا کہ بجائے شہر کے جلدی سے باہر والی سڑک سے نکال لیچلو۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی کہ بڑے ماموں صاحب پھر موٹر کا جائزہ لینے آئے اور معلوم کرکے کہ سب ٹہیک ہے۔ چلدیئے۔

ہماری چھوٹی سی موٹر یکّوں اور تانگوں کی بہیڑ بہاڑ سے نکلکر صاف سڑک پر آئی اور پھر جو ہمارے اناڑی ڈرائیور نے صاف سڑک پر بے تحاشا چھوڑا ہے تو لطف ہی تو آگیا۔ ہوا کا فراٹا پردوں کو پہاڑے ڈالتا تہا۔ اور تہوڑی ہی دیر بعد اسی ہوا کی تیزی اور تُندی سے وہ آگے کا پردہ جو ہمارے اور ڈرائیور کے درمیان حایل تہا اور جو آگے والی کُرسیوں کے تکیہ میں سدہا تھا ہوا کے فراٹے سے کُہل گیا۔ قبل اس کے کہ کُہل جائے میں نے جھٹ سے دونوں ہاتھوں سے پردہ کو تکیہ پر دبا لیا اور شاہدہ سے کہا کہ "بہن میں پکڑے ہوں تو باندھ دے"۔ مُجھے کیا معلوم کہ شاہدہ پر شرارت کا جِن سوار ہے۔ اس نے جو دیکہا کہ میرے دونوں ہاتھ گہرے ہوئے ہیں اور پردہ ہہیں چھوڑ سکتی تو بجائے پردہ باندھنے کے اُوسے گُدگُدانا مُجھے شروع کیا۔

"اری کمبخت"، میں نے ہنسی روکتے ہوئے چپکے سے کہا۔ "میں چھوڑے دیتی ہوں"۔

"چھوڑ دے"۔ شاہدہ نے لاپرواہی سے کہا اور پھر میری طرف گُدگُدانے کے لئے انگلی لیلیا کر دوڑائی۔ میں نے ہار مانی اور چُپکے سے اس کے کان سے منہ ملا کر اعتراف شکست میں "جیں"

تولدی۔ شاہدہ نے چپکے سے کہا "خیر اب تو چیں بول گئی اس لئے گدگداونگی تو نہیں مگر تو نے مجھے دھکیلا تھا لہذا اسکی یہی سزا ہے کہ اب اسی طرح پردہ کو پکڑے بندھی رہ"

بات دراصل یہ تھی کہ پردہ اس طرح کھلا تھا کہ اگر ایک بھی ہاتھ ہٹاتی تو پردہ اڑکر باہر کے دونوں بیٹھنے والوں کو گویا سمیٹ کر موٹر کے دونوں حصوں کو ایک کر دیتا۔

میں سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ کیسے پردہ باندھوں۔ میں نے شاہدہ سے چپکے سے کہا "بہن باندھ دے" مگر وہ نہ مانی۔ میں نے کہا کہ "اگر تو میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی" کہنے لگی "میں تو چھوڑ دیتی پردہ کو"

اور واقعہ یہ ہے کہ وہ میری جگہ ہوتی تو واقعی چھوڑ دیتی۔ بس یہی مجھ میں اور شاہدہ میں فرق تھا۔

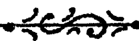
میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک اور معاملہ پیش آیا۔ میں نے کوشش کر کے پردہ کو ایک ہاتھ سے قابو میں کر کے اپنا داہنا ہاتھ آزاد کر لیا۔ اب میں نے پردہ جو باندھنے کی کوشش کی تو کیا دیکھتی ہوں کہ پردہ جو اوپر کو سمٹا تو وہیں سے ڈرائیور کی ترکی ٹوپی کا پھندنا اسکی کرسی کے تکیہ پر سے ہوکر لٹکتا ہوا نظر آیا۔ اب اسے جو شاہدہ نے دیکھا تو مجھے دھمکی دی کہ اگر تو نے پردہ دوسرے ہاتھ سے باندھا تو میں ٹوپی کا پھندنا کھینچتی ہوں ادھر میں نے پردہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ادھر اسنے پھندنے کیطرف۔ میں نے اس کا ہاتھ روکا تو وہ سکے تو دونوں ہاتھ آزاد تھے اوس نے دوسرا ہاتھ اپنا مجھے گدگدانے کو بڑھایا۔ میرا ہنسی کے مارے الگ برا حال تھا مگر میں اب ذرا گھبرائی۔ یا میرے اللہ میں نے دل میں کہا آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے گدگدی کو تو ہمت کر کے ضبط کیا اور چاہا کہ جلدی سے پردہ باندھ دوں۔ شاہدہ نے جو یہ دیکھا تو اوسنے جھٹ سے ٹوپی کا پھندنا پکڑ لیا میں گھبرا گئی اور میں نے اوس سے پریشان ہوکر کہا۔ "خدا کے لئے بہن تو پھندنا چھوڑ دے لے میں ہاتھ ہٹائے لیتی ہوں"

میں شاید یہ واہ نہ کرتی اگر کہیں پھندنا میری طرف نہ لٹکتا ہوتا گو میں جانتی تھی کہ شاہدہ پھندنے کو مٹھی میں اسطرح لئے ہوئے تھی کہ اگر ڈرائیور سر ہلائے تو اس سے پہلے ہی وہ چھوڑ دے مگر پھر بھی مجھے

اندیشہ رہا کہ اگر ایک دم سے جھٹکے کے ساتھ اوس کا سر ہلا تو کیا ہوگا۔

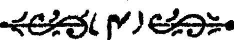
میرا گھبرانا حق بجانب تھا۔ خدا کی شان کہ بعض اوقات جو آدمی سوچتا ہے وہی ہو جاتا ہے ایک دم سے توپ کا سا ایک گولا چھوٹا۔ ایک جھٹکا لگا میرے اور شاہدہ کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی یہ وہ میرے ہاتھ سے پھڑ پھڑا کر صاف نکل گیا۔ بی شاہدہ اُنہی حضرت کی ترکی ٹوپی کا پھندنا پکڑے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھیں جنہیں میں نے اُنہیں ڈھکیلا تھا! موٹر رک چکا تھا۔ ڈرائیور نے ہم کہانیکو تو ہی ٹوپی کی طرف دیکھا پھر جلدی سے اُدھر وہ اُترے موٹر سے اور ادھر میں نے پردہ درست کیا۔ شاہدہ ایسی بدحواس تھی کہ ابتک ٹوپی اُسی طرح لٹکائے تھی۔ میں نے کہا "مُردی پھینک ٹوپی جلدی سے" میں نے جلدی سے ٹوپی لیکر ڈرائیور کی سیٹ پر ڈالدی۔

اب میں نے شاہدہ کو مارنا شروع کیا کہ بےکمبخت تو مجھے ذلیل کراتی تھی۔ میں خوش تھی کہ اچھا ہوا کہ دونوں مردوں نے اسے دیکھ لیا کہ اسنے ٹوپی جھپٹ لی ہے۔



ٹیوب پھٹ گیا تھا اور جلدی جلدی پہیا اُتار کر دوسرا چڑھایا گیا۔ مجھے اور شاہدہ دونوں کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کون ہے۔ ہم دونوں کو تعجب ہوا کہ ہمارا ڈرائیور وہی شخص ہے جسپر میں نے شاہدہ کو دھکیلا تھا۔ یہ کون ہے۔ ہم دونوں نے اندازہ لگایا۔ شاہدہ نے غور سے جھانک کر پھر دیکھا اور کہا کہ ہو نہ ہو یہ بھی دولہن کے بھائی بندوں میں سے ہوگا۔

بہت جلد موٹر نے ہمیں منزل مقصود پر پہونچا دیا ہم لوگ بڑے عالیشان مکان میں ٹھہرائے گئے تھے۔ بس ناشتہ چھپا ہی جارہا تھا جب ہم پہونچے ہیں۔



دولہن والوں کے یہاں جب جانیکا وقت آیا تو ایک نے ایک سے بڑھ چڑھ کر کپڑے

نکالے۔ شاہدہ نے اپنا بہترین نئے فیشن والا جارجیٹ کا دھانی جمپر نکالا اور اُسی کے جوڑ کا دھانی رنگ کا دوپٹہ جس پر بے پوری حیدری جیسی ہوتی تھی اور استولی بیلیں ٹکی ہوتی تھیں جمپر میں جگہ جگہ اسپٹین اور سچے آویزے اور موتی ٹکے ہوئے تھے۔ اسی رنگ کی ساٹن کی شلوار پہنکر شاہدہ بی تو سچ مچ کی نیلم پری بن گئیں طرح طرح سے بال میں پیچ نکالے گئے اور ہر پہلو سے آئینہ میں کھڑے ہوکر دیکھا گیا۔ یہ سب کیوں؟ محض سمدہنوں پر رُعب ڈالنے کے لئے۔ مجھ سے شاہدہ نے کہا کہ "تجھے ایسے کپڑے نہیں پہننے دونگی۔ تو اپنی تانبڑے کے رنگ کی بھاری والی ساڑی پہن"۔ پھر یہ بھی طے ہوا کہ محفل میں ہم دونوں پھر روپ بدلیں یعنی وہاں موقعہ سے میں اپنا نیلے رنگ کا موتیوں والا جوڑا پہنوں گی اور بی شاہدہ اپنا ساری جوڑا نکالیں گی۔ قصہ مختصر یہ ٹھاٹھ بنا کر اور سج سجا کر ہم دونوں دولہن کے گھر روانہ ہوئیں۔



ایک شاندار کوٹھی پر ہماری موٹریں لگیں۔ یہ مردانہ کوٹھی تھی۔ دو بڑے بڑے کمروں میں سے ہوکر سب بی بیاں ایک چھوٹے سے باغیچہ میں پہونچیں۔ یہ کوٹھی کا اندرونی صحن بھی تھا اور باغیچہ بھی اور یہاں ہم سب کا دولہن والیوں نے استقبال کیا یہاں اب ایک تماشہ دیکھا اور تھوری دیر کے لئے سب بی بیاں رُک گئیں بائیں جانب کو ایک طرف ایک حوض کے بیچوں بیچ میں فوارہ چھوٹ رہا تھا اور پانی کی دھار پر ایک بڑا سا رنگیں سیلولائڈ کا گیند یا قمقمہ بلندی پر ناچ رہا تھا۔ ناچتے ناچتے ایک دم سے جالی کے پیالے میں گرتا جس کے بیچوں بیچ میں پانی کا سوراخ تھا اور جیسے ہی سوراخ پر آتا پھر ناچتا ہوا پانی کی دھار سے اوپر کو بڑے مزے سے چڑھا چلا جاتا سب بی بیاں یہ دیکھنے لگیں کہ اتنے میں ایک چھوٹے سے لڑکے نے قریب کی روش کے پاس بیٹھکر کنٹرول پائپ کو کھولنا بند کرنا شروع کیا۔ اب گیند بڑی تیزی سے گرنے اور اُٹھنے لگا سب نے اسے غور سے دیکھا اور یہاں سے

آہستہ آہستہ پھولوں کے گملوں کو دیکھتی ہوئی سامنے کے دروازہ کی طرف بڑھیں۔ مجھ سے شاہدہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا: "بجعت ذرا ٹھہر تو۔ لاؤ اسے دیکھیں"۔ یہ کہکر اب خود شاہدہ یا تیب کا دستہ کھولنے بند کرنے لگی بیں ہی اس تماشہ کو دیکھنے لگی اور ہم دونوں کو اسکی محویت میں خیال ہی نہ رہا کہ سب کی سب بی بیاں گئیں۔ اب میری باری آئی اور میں دستہ کو موڑ رہی تھی کہ کمروں کیطرف سے مردوں کی آوازیں سنائی دیں جو یہ خیال کرکے کہ عورتیں جا چکیں اب اسطرف آرہے تھے' میں گھبرا کر اٹھی اور گویا اب میں نے دیکھا کہ سب بی بیاں گئیں۔ شاہدہ تاک لگا کر ایک پھول پر سے تتلی پکڑ رہی تھی کہ میں نے زور سے اسکے گھونسا دیا کہ "بھاگ"! یہ کہکر میں سیدھی تیزی سے زنانخانہ کے دروازہ کی طرف بھاگی جدھر سب بی بیاں گئی تھیں اور میرے پیچھے پیچھے شاہدہ۔

اب ذرا ایک نئی سنئے۔ ہمارے ڈرائیور صاحب۔ وہ جنہیں میں نے شاہدہ کو دکھلایا تھا سچ مچ ہمارے اندازہ کے مطابق دولہن کے بھائی نکلے۔ جب ہم سب اتری تھیں تو وہ اندر سے چلے آرہے تھے' ہاتھ میں گلاب جامنیں بھری رکابی لئے۔ ادھر سے جو ٹکر ہوا تو مجبوراً انہیں کمرے کے پاس کی ایک کوٹھری میں بند ہونا پڑا۔ جب سب بی بیاں اندر پہونچ گئیں تو انہیں رہائی ملی اور یہ باہر مردانہ کی طرف لپکے' وہ بھی اس طرح کہ بائیں ہاتھ میں گلاب جامنوں کی بھری رکابی اور داہنے ہاتھ میں ایک تگڑی سی شیرہ میں لوٹ پوٹ گلاب جامن جسکو وہ شاید بہت سے شیرہ میں لپیٹ لپاٹ کے لقمہ تر بنا یوا لے ہی تھے کہ ادھر سے میں اور شاہدہ ڈاک گاڑی کی رفتار سے پہونچیں۔ نتیجہ یہ کہ آگے میں تھی اور گویا گھوڑے پر ہوا کے سوار آرہی تھی۔ اور آندھی اور بجلی کی طرح ایک جھپٹے میں گلاب جامنوں کی رکابی اڑاتے نکلی چلی گئی۔ بی شاہدہ چونکہ پیچھے ہوے کے ذرا جھجکیں۔ اس غریب کا خدا بھلا کرے جو اسے سوچا کہ لڑکی اچھی ہے۔ صبح اسٹیشن پر عید بھی مل چکی ہے۔ پھر راستہ میں ٹوپی بھی اچک چکی ہے۔ گلاب جامن لاؤ اسے ہی

کھلادوں۔ ادہر بی شاہدہ سے اسسے ٹکر ہوتے ہوتے بچی ہے اور وہ جھکی ہیں کہ اُنسے شاید ہی سب باہیں سوچکر آؤ دیکھا نہ تاؤ قبل اس کے کہ بی شاہدہ اپنی تیزی میں رُک سکیں اُسے لپک کے نہایت ہی چابک دستی سے اور قبل اس کے کہ بی شاہدہ دیکھ یا سمجھ سکیں کہ کیا معاملہ ہے دہی شیرہ میں چور گلاب جامن اپی دانست میں بی شاہدہ کے منہ میں بس ٹھونس ہی تو دی۔ یہ سب چشم زدن کا کام تھا اور بی شاہدہ بل کھاکر غوطہ مار کر مجھ سے آلڑیں! یہ سب کچھ بس اتنی جلدی ہوگیا کہ وہ ادہر نکل گیا اور ہم اِدہر۔ لیکن اب جو میں بی شاہدہ کو دیکھتی ہوں تو عجیب حال! ناک اور منہ کا تو خیر ذکر ہی کیا سارے منہ پر اس ملایم اور شیرہ سے چور گلاب جامن کا وہ بڑھیا قسم کا پلاستر ہوا ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ لیکن ایک شاہراہ اس پلاسٹر کی ناک کے مشرق کی طرف ہوکر سیدھی آنکھ میں جیپڑ کا رنگ جماتی سیدہی ماتھے پر سے ہوتی ہوئی بالوں میں گھس گئی تھی۔ وہ دیکھنے کے قابل تھی کس طرح بی شاہدہ نے کاسمٹک سے اپنے مال بنائے تھے اور اب اُنپر گلاب جامن کے شیرہ نے گویا کریم لگادی پھر علاوہ منہ کے گردن اور کان تک نہ بچ سکا۔ مگر اصل مصیبت یہ تھی کہ چھتیس جگہ سے جارجیٹ کا جمپر چپک کر رہ گیا اور پھر جارجیٹ کا روپٹہ تو شیرہ اور پلاسٹر میں بس کر اور چپک کر گلے میں اُلجھ گیا۔ قصہ مختصر ایک چھٹانک بھر کی گلاب جامن بالکل ملایم گھلی ہوئی اور رس بھری ہوئی جمپر۔ روپٹہ۔ منہ۔ گردن اور بالوں پر صرف کردی گئی۔

چونکہ میں نے دیکھا نہ تھا کہ کیا گذری لہذا یہ حالت دیکھکر مجھے تعجب ہوا اور میں نے کہا "اری کمبخت یہ کیا ہوا۔ کیا تو گر پڑی گلاب جامنوں میں؟"

اس نے روپٹہ گلے سے کھینچتے ہوئے اور پلاستر کو گلے پر دہی آزادی سے ملتے ہوئے گویا ڈکر کہا "اری بہن میں کیا کروں؟"

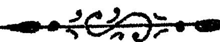
"اری بول تو کچھ" میں نے بے طرح ہنستے ہوئے کہا "یہ تو کیسے سب لتھڑ پتھڑ ہوگئی" پھر

اوسی طرح روکر شاہدہ بولی "بہن میں کیا بتاؤں تجھ کو۔ اب میں کیا کروں؟" وہ تو کہو خوش قسمتی سے صحن بڑا کشادہ تھا اور ہم لوگوں کی آمد کی وجہ سے ہر کس و ناکس سامنے کے کمروں اور دالانوں کی طرف تھا ورنہ کیا کچھ نہ تماشہ ہوتا۔ شاہدہ کی آنکھوں میں ایسی یہ دُرگت دیکھکر آنسو نکل آئے اور اب اس نے کوسنا شروع کیا تو میں سمجھی کہ گڑبڑ ہے پھر ادہر اُس نے کوس کوس کر پہلی بات بتائی اور اُدہر میرا ہنسی کے مارے بُرا حال۔ میں نے کہا کہ بہن تیری یہی سزا ہے۔ چلتوں کو چھیڑتی ہے تا تو یہی تیری سزا ہے پاس ہی آبدار خانہ تہا اور وہاں بیٹھکر بی شاہدہ کو میں نے دُھلانا شروع کیا۔ یہ کارروائی ہو ہی رہی تہی کہ ایک ملازمہ آ کھڑی ہوئی۔ اب اس نے یہ معاملہ دیکھکر تنگ کرنا شروع کیا اور لگی سوال ٹیڑھے ٹیڑھے کرنے۔ مجھے ایسے موقعہ پر اور بہی ہنسی چھوٹی۔ اسکی فضول باتوں کے جواب دیئے نہ تھے کہ ایک اور ملازمہ باہر سے آئی یہ کہتی ہوئی کہ رستہ میں گلاب جامنیں کیسی پڑی ہیں؟ پہلے والی جو ہمارا ناطقہ بند کر رہی تہی ایکدم سے بولی "ارے۔ ابھی تو میاں شاہد رکابی لیکر گئے ہیں" اس لفظ شاہد پر ہم دونوں کا چونکنا اور پھر اس کا مشکوک نگاہوں سے ہم دونوں کو اس حلیہ سے دیکھنا کہ ایک گلاب جامنوں کی چیکا چپکی دھو رہی ہے اور دوسری دُہلا رہی ہے۔ پھر شاہدہ کا پریشان ہونا اور میرا مارے ہنسی کے لوٹنے کی دہار بجائے شاہد کے ہاتھ پڑ ڈالے کے اس کے گلے میں چھوڑ دینا اور اسکا چیخنا اور مجھے کوسنا۔ وہ سمجھ گئی اور گلاب جامنیں دیکھکر جو آئی تو مسکراتی ہوئی بولی۔

"کیا شاہد میاں سے.. اُدہر آپ جلدی میں آئی ہونگی"

میری طبیعت اسوقت شاہدہ کی مصیبت کیوجہ سے ضرورت سے زیادہ موزوں ہو رہی تہی چنانچہ میں نے ہنستے ہوئے اس سے کہا "اُن کا نام میاں شاہد ہے؟ ہماری بہن شاہدہ بی کی ان سے ٹکر ہو گئی"

"اِس کا نام ا" ملازمہ نے کہا۔
میں نے کہا۔ "ہاں!"
"اور ہمارے چھوٹے میاں کا بھی یہی نام ہے"۔ یہ کہکر اس ملازمہ نے شاہدہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جو دیکھا ہے تو بی شاہدہ کو دوسری طرف مُنہ کرکے رومال نچوڑنا پڑا۔
میں نے شاہدہ کو اتنا حیران اور اتنا پریشان اور سہما ہوا اور مارے شرم کے عرق عرق شاید کبھی نہیں دیکھا جب اُسنے مجھ سے پوچھا "بیٹی تمہاری تو اللہ رکھے شادی ہو گئی ہے نا؟" کہا تو اُسنے یہ مجھ سے اور شاہدہ نے شاید اسو جہ گھبرا کر کہ اب میری باری آئے گی مجھے ڈانٹ بتائی کہ فضول باتیں کر رہی ہو سوٹ کیس جلدی نہیں منگواتیں۔ رات کی محفل کے لئے ہم دونوں کے جوڑے اسی سوٹ کیس میں تھے۔
مُلازمہ نے بی شاہدہ کو غسل خانہ کا راستہ بتایا اور میں نے جلدی سے مہمانوں میں پہونچکر سب سے پہلے یہ کام کیا کہ سوٹ کیس غسل خانہ میں بھجوایا تاکہ بی شاہدہ رات والا جوڑا قبل از وقت پہنکر اپنی جان بھیگی چارجیٹ سے بچائیں۔



رات کی محفل نہایت ہی بارونق اور انتہا سے زیادہ دلچسپ ہی کئی ہمعمروں سے خوب دل بہلا، پھر شادی کی گہما گہمی۔ مگر سب سے زیادہ قابلِ ذکر جو بات رہی وہ یہ کہ کئی بیویوں کی نظریں شاہدہ پر بیطرح پڑ رہی تھی۔ وہ برابر کئی جوڑ آنکھوں کا مرکز بنی رہی۔ خصوصًا دولہن کی ماں جس نظرِ بد سے دیکھ رہی تھیں وہ قابلِ ذکر نہیں بلکہ قابلِ اعتراض تھی۔
ہمارے قصّہ سے متعلق خاص بات کوئی اور نہیں اور یہاں شادی کی تفصیل بیان کرنا بے سود ہے۔ بس یہی کہدینا کافی ہے کہ ایک چاند سی دُولہن کو ہم بیاہ لائے۔



باب ششم
"نجمی"

(۱)

حم والی نے گلاب جامن کا قصّہ بڑی دلچسپی سے سُننے کے بعد اپنی بیتی سنائی۔ کہنے لگیں

"بہن جسرو تم دونوں شادی میں گئی ہو اُس کے تیسرے روز کا ذکر ہے کہ شام کا وقت تھا اور قطار در قطار کوّے اُڑتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ نجمی نے ابا کا ایئر پسل نکالا اور کہنے لگے چلو کوّے ماریں۔ زینت اور میں اور نجمی تینوں باغ کے کنارہ احاطہ کی دیوار کے پاس آ گئے۔ کوّے قطاریں باندھے غول کے غول اُڑے جارہے تھے اور نجمی نے فیر پہ فیر کرنا شروع کئے۔ دو دفعہ کوّے بال بال بچے کہ آخر ایک کوّے کی دم پہ لگی اور اسکا صرف ایک پر کٹ کر گرا۔ گھومتا ہوا نیچے آیا۔ خوب ہنسی ہوئی اور میں نے بھی کہا کہ آپنے گھنٹہ بھر کی گولہ باری کے بعد مارا بھی کیا؟ محض کوّے کی دُم!! اتنے میں چند پہلے مالن کھیتوں کی طرف سے چلے آرہے تھے اور میں اور زینت جھٹ سے غوطہ مار کر کمر کمر دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئیں۔

"کیا واہیات ہے!" نجمی نے کہا۔ "تم لوگ پردہ کرتی ہو یا مذاق، گنوار اور دیہاتی میبیوں گذر گئے تو کھڑی اُچھلتی رہیں!"

یہ کہکر ایک صاحب کو پکارے "اجی حضرت یہاں آئیگا۔ قبلہ یہاں آئیگا۔ جی ہاں

.. ... آپ . آپکو.. . ذرا تکلیف فرمائیگا "
"آپ کیوں بلاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"کوّے کے بچے پوچھنے کے لئے" نحمی نے کہا۔" اب چُھپی ہو تو ذرا اچھی طرح دبکی بیٹھی رہو"
ہم دونوں اور بھی دبک کر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں وہ حضرت قریب آگئے۔
کہنے لگے "فرمایئے"
نحمی بولے "اِدہر آیئے"
انکا ہاتھ پکڑ کر نحمی نے ایک جگہ دیوار ٹوٹی ہوئی تہی وہاں سے اُنکو اندر لیکر ہم دونوں کی طرف دِکہا کر کہا "آپ پردہ نشیں خاتونیں ہیں .. . . ."
"ارے!. . لاحول ولا قوت" کہکر وہ مولانا اُدہر اُچک کر بہاگے اور بڑبڑاتے چلے گئے۔ نحمی نے پکار کر کہا "اِدہر مت دیکھیئے گا" فوراً انھوں نے مُڑکر دیکھا اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی پھر ایک دم سے مُنہ موڑ لیا میرا اور زینت کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو گیا۔

(۲)

نحمی نے پھر کوؤں پر نشانہ بازی شروع کر دی تہی اور آخر کار ایک کوّا مار گرایا۔ یہ احاطہ سے باہر دُور جا کر گرا اور نحمی دیوار پہاند کر لپکے میں نے زینت سے کہا کہ چل مگر وہ کہنے لگی کہ میں احاطہ کے باہر نہیں جاتی لیکن میرے راستہ ہی میں تہا لہذا میں دیوار کُود کر لپکی۔
کوّے کے پر میں لگی تہی مگر اس کے دونوں پیر ثابت تھے اور وہ بہاگا۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور کھیتوں میں کوّے کے پیچھے نحمی اور نحمی کے پیچھے میں بہاگتی جا رہی تہی کہ آخر کو کوّے کو نحمی نے پکڑ لیا۔ "مجھے دکہایئے۔ مجھے دکہایئے" یہ کہکر میں نے کوّے کو دیکھا بُری طرح ہانپ رہا تہا، چونچ پہٹی ہوئی تہی اور نحمی نے سیدھے ہاتھ سے اُسکی گردن معہ سر کے پکڑ رہی تہی اور اُلٹے ہاتھ سے دونوں

پیر۔ میں نے کہا "اسے پانی پلائیں گے جلدی کیجئیے۔" اتنے میں اُسنے چونچ اپنی بند کرلی اور بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا مجھے بڑا ترس آیا میں نے انگلی اُسکی طرف بڑھائی تو نجمی نے کہا کہ "انگلی قریب مت لاؤ ورنہ کاٹ کھائے گا۔ کوّا بڑے زور سے کاٹتا ہے" میں ہنسنے لگی اور میں نے اور بھی انگلی اس کے قریب کرکے اسکی چونچ پر پھیری۔ وہ کچھ نہ بولا میں چونچ پر اسکی انگلی پھیرتی رہی۔ نجمی نے بھی دیکھا کہ کوّا بے بس ہوکر بے حس ہوگیا تو اوسکے تنکے چھوڑ دیئے اور وہ بس چلے۔ میں نے نجمی کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ کر کوّے کو اپنے قریب کرکے اُس کے سر پر اُنگلی پھیرنا شروع کی۔ "بڑا سیدھا کوّا ہے" میں نے کہا "آپنے ناحق بیچارے کو مارا۔ دیکھیے . . دیکھیے . . " یہ کہکر میں نے اپنی انگلی اس کی باچھوں کے پاس چونچ کے اندر رکھدی اُس نے آہستہ سے اور بڑی رسانیت سے دبائی اور پھر چھوڑ دی۔ اب مجھے بڑا ترس آیا اور میں نے کہا کہ "کوّے کو مجھے دیدیجئے" نجمی نے احتیاط سے کوّے کو میرے ہاتھ میں دیدیا۔ مجھے اور بھی ترس آیا اور میں نے کہا "سچ سچ . آپ نے ناحق اسکو مارا بڑا سیدھا کوا ہے" یہ کہکر میں اُسکو چمکارتی تھی جیسے کوئی بچہ کو چمکارتا ہے "بڑا سیدھا کوّا ہے" یہ کہکر جو میں نے مُنہ قریب کرکے اسکو چمکارا تو وہ کمبخت موذی کوّا خدا اسکو غارت کرے . مر ہی گیا . بس تو کمبخت کو پیار کررہی تھی اور اس نے اس زور سے میرے گال میں . اس جگہ بوٹی بھرلی کہ میں ایک دم سے چیخ پڑی .

خدا کی پناہ . . . . وہ نامراد کوّا میرے گال سے لٹک رہا تھا اور پنجوں سے میری عینک پکڑکر جو ایک دم سے اوس نے میرے مُنہ پر پر پھڑ پھڑائے ہیں تو دہشت سے میں چیخ مار کر گری۔ میں دیوانہ وار گھبرا کر مچھلی کی طرح تڑپ گئی مگر وہ کوّا ہے کہ نہیں چھوڑتا۔ نجمی نے گھبرا کر دراد شواری سے کوّے کی ٹانگیں پکڑیں مگر اوس نے تو میرے گال میں چونچ ایسی گاڑ رکھی تھی کہ میرا دم نکلا جاتا تھا۔ اب میری جان عجیب مصیبت میں تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے دو چاقو گھسے ہوئے ہیں۔ نجمی

بھی گھبرا گئے اور اُنھوں نے گویا زبردستی اپنے بائیں ہاتھ سے میرا سر اپنے سینہ پر ٹکا کر داہنے ہاتھ سے کوئے کا سر پکڑ کر اوس کی چونچ میں انگلی ڈالکر یا جس طرح بن پڑا اُس کوّے کو ایسا دبایا کہ میری جان چھوٹی۔ ایک ثیجی کوّے کو دیکر الگ پھینکا اور پھر پھر "

"یہ بات!" شاہدہ نے کہا اور دہیمے سے ایک گھونسا جم والی کی پیٹھ پر زور سے دیا اور بولی۔ "میں نہ کہتی تھی وہ ایک بدمعاش اور آوارہ آدمی ہے۔ ایسے کے سامنے بھلا مجھے پکڑ دھکڑ کرتی تھیں" کچھ سنجیدہ ہوکر شاہدہ نے کہا "ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ لوگوں کو دہوکا دیکر معصوم سے پھرتے ہیں۔"

جم والی بولیں: "بہن میں نے تو جم کی باتوں پر بھروسہ کیا۔ میں کیا جانتی تھی۔ چھوٹا اول نمبر کا دغاباز ہے . مارے غصہ کے میرا بُرا حال ہو گیا۔ میں نے ایک جھٹکا دیا اور کہا "شرم نہیں آتی تمکو بدتمیز . ." میں تن بدن سے غصہ میں کانپ رہی تھی۔ ڈانٹ کر میں نے پھر کہا: "کمینہ . ذلیل . . شرم نہیں آتی تمکو "

یہ کہکر میں نے نجمی کو از سرتاپا دیکھا سورج غروب ہوگیا تھا سامنے فاصلہ پر ریت دیوار کے پاس کھڑی تھی کپکپاتی آواز سے نجمی نے کہا: "معاف کرو مجھ سے غلطی ہوئی۔"

اب میں غصہ کے فوری اشتعال کی بہری کم ہونے کی وجہ سے صدمہ کے مارے رونے لگی اور سیدھا گھر کا رُخ کیا۔ مگر نجمی ساتھ ہی ہو لئے۔ "معاف کرو۔ خدا کے واسطے معاف کرو مجھ سے خطا ہوئی . . . . اتفاقاً ایسا ہوا خدا کے واسطے معاف کرو "

غرض معاف کرو کی رٹ لگاتے ہوئے وہ میرے آگے آجاتے۔ کس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر اُنھوں نے کہا مگر میں اپنی دُھن میں رومال میں منہ چھپائے خاموش تیزی سے چلی جا رہی تھی اس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر فقیروں کے لہجہ میں ایک شریف نوجوان کا اپنی خطا کا اقبال کرنا اور

بے در بے سنجیدگی سے خوشامد کرنا میرے اوپر کچھ اثر کرنے لگا۔ جب دیکھا کہ میں قریب پہونچ گئی اور لیبے احاطہ میں قدم رکھنے ہی والی ہوں تو اس مردۂ خدا نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور داہنے ہاتھ میں اپنے پستول لیکر کہا "تمہیں حرم کی قسم مجھے معاف کردو ورنہ اپنے گولی ماروں گا۔"

معاف کیا" میں نے گھبرا کر کہا "معاف کیا۔ مجھے قسمیں مت دیجئے میں نے معاف کر دیا۔"

"اس کا ذکر۔۔ ۔"

"میں کسی سے نہ کہونگی۔" میں نے کہا۔

(۳)

دو روز میں نہ گئی تو تیسرے روز زینت نے مجھے بلا بھیجا۔ میں پہونچی تو ایک انقلاب عظیم انجمی کا خوبصورت اور شاندار چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ پیشتر کی بشاشتی کو دیکھتے ہوئے وہاں ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ ایک ناقابل بیان سکوت اور خاموشی۔ زینت نے کہا کہ نجمی بھائی برسوں سے چپ اور رنجیدہ ہیں بھائی کیا بات ہے۔ کچھ تو بولئے" اس کے جواب میں نجمی نے کہا۔ "کچھ نہیں" اور پھر وہی خاموشی۔ ہر دل خوش کن تحریر کو رد کر دیا۔

علیحدہ لیجا کر زینت نے مجھ سے پوچھا "یہ کیا بات ہے؟ کیا کچھ کوٹے والے روز۔۔ ۔ ۔"

میں نے کہا "ہاں" اور پوری کیفیت شروع سے آخیر تک کہہ سنائی۔ مجھ سے زینت نے کچھ وحشت زدہ ہوکر کہا "بہن تو اب مت آنا جانا۔ بیاہی لڑکی۔ ۔ دنیا ہے اور پھر آج کل ذرا ہم لوگوں کو آزادی ملی اور لوگوں نے بے پر کی اڑائی۔"

میں نے ہنسکر کہا "تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ اپنا دل سچا ہونا چاہئے اور بس مجھے کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔"

"کمبخت کہیں بھاگ مت جائیو اسکے ساتھ۔" شاہدہ بولی "نہیں تو ہم لوگوں کو پھر قید ہی

ہوجائے گی۔"

جم والی نے کہا "تو ہی بے شرم اور بے تکی ہو رہی ہے۔ میرا کیا ہے میں بیاہی ہوئی ہوں اور مجھے ذرا بھر ڈر نہیں۔"

"سمجھی کیا ہے تو اسکو" شاہدہ نے سر ہلا کر کہا "اسکے ساتھ زیادہ آنکھ مچولی کھیلے گی تو واپس آنکر تیری چوٹی تو ویسے ہی نہیں ہے سر مونڈ لیگا۔"

"کون؟" جم والی جیں بجیں ہو کے بولیں "کون ہے ایسا؟ کون؟"

"ارے وہی تیرا" شاہدہ نے ایک آنکھ میچ کے کہا "وہی" "اور کون۔"

"معاف کیجئے گا" جم والی حقارت آمیز لہجہ میں بولیں "نہ میں ایسی اور نہ میرا میاں ایسا، صل چیبر محبت ہے اگر انکو میری محبت ہے اور مجھے انکی تو نہ تو میں بگڑ سکتی ہوں اور نہ وہ۔ . . . دنیا کہتی بکتی ہے . . . . پھر تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے چلی آئی۔

اس کے بعد اب برسوں کا ذکر ہے۔ رات کو زینت کا مالی لالٹین لیکر آیا اور کہا آپ کو بلایا ہے۔ ایک رقعہ تھا میں نے پڑھا خاتون بی کی طرف سے تھا کہ فوراً چلی آؤ میں نے بھائی جان سے پوچھا تو انہوں نے کہا چلی جاؤ اور پھر بھلا شاہدہ بہن کی سد بلائیں اور میں نہ جاؤں یہ کیسے . . . . . اری چھوڑ۔ چھوڑ . . ." شاہدہ نے وہی جگہ پکڑ لی جہاں جم والی کے کوا لپٹ گیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"اری چھوڑ۔ . چھوڑ . . . چیں" . . . جم والی چیں، بولیں تو شاہدہ نے چھوڑا۔ جم والی اپنا دکھتا رخسار دبا کر رہ گئیں کیونکہ کوے کمبخت نے بڑے زور سے کاٹا تھا ایسا کہ ورم ہو کر اب گھمنڈ آ گیا تھا۔ جم والی نے پھر سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

"میں یہی سمجھی کہ خاتون بی اپنے مطلب کے لئے آئی ہو گی۔ جب سے وہ تیرے میرے پاس

برابر دوڑ رہی ہیں چنانچہ میں چلی گئی رات کو ریت اپنے کمرہ کی چھت پر بیٹھتی ہے میں سیدھی اوپر چھت پر پہونچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ نجمی ہا حالانکہ اُن کا کمرہ اس سرے پر ہے۔ میں کچھ رُکی کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے میں نے کہا "زینت کہاں ہیں ؟" وہ بولے "آتی ہیں بیٹھئے" میں بیٹھ گئی تو بولے "آپکو میں نے بلایا ہے"

"فرمائیے"

"یہ لیجئے" نجمی نے یہ کہکر ایک خط میرے ہاتھ میں دیدیا۔

"اسمیں کیا لکھا تھا؟" شاہدہ نے پوچھا۔

جم والی بولیں "وہ وہیں رہ گیا۔ اسمیں تمام خرافات لکھی تہی۔ مطلب یہ تھا کہ میں جم کو چھوڑکر اِن سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤں" میں نے خط کو پڑھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو نجمی بولے "آپ بیکار اِدھر اُدھر دیکھتی ہیں۔ گھر پر آج کوئی نہیں ہے سوائے میرے اور آپ کو اس خط کا جواب بھی ابھی دینا پڑے گا"

میں کچھ پریشان سی ہو گئی کیونکہ نجمی کے چہرہ پر کچھ وحشت سی تہی۔ لیکن میں نے سنبھلکر کہا "نجمی صاحب آپ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اول تو میں جم کو چاہے جان جائے یا رہے۔ ہرگز ہرگز نہ چھوڑوں گی اور پھر آپ ذرا غور تو کیجئے کہ میری تو شادی اُنکے ساتھ ہو چکی ہے ایک بیاہی ہوئی لڑکی سے آپکی یہ درخواست ۔۔ ہاں اگر میری شادی نہ ہو گئی ہوتی تو آپ اگر اس قسم کی بات کرتے تو بیجا نہ تھا"

نجمی نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا نکاح آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی نے کیا ہے"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے"

"جب آپ نابالغ تھیں"

"جی"

"تو اب آپ اسکو فسخ کر سکتی ہیں"

"مگر میں تو نہیں کرنا چاہتی" تڑک کر میں نے کہا۔

"آپ کو کرنا پڑے گا" کھڑے ہو کر تحمی نے کہا۔

"ہرگز نہیں" کپکپاتے ہوئے میں نے کہا۔

"قطعی" تحمی نے ریوالور نکالکر کہا۔

"مجھے مار ڈالو۔ "میں نے جھنکر کہا۔

ایک جست کے ساتھ چیتے کی طرح وہ ظالم میرے اوپر جھپٹ پڑا۔ اُسکا خوفناک پنجہ میری گردن میں تھا اور قبل اس کے کہ میرے منہ سے چیخ نکلے میرا گلا اس نے چارپائی پر ڈالکر گھونٹ دیا۔ گردن دباکر اس نے کہا "بولو؟" جانکنی کی تکلیف اٹھاتے ہوئے میں نے زور سے "نہیں" کہنے کی کوشش کی اور سر ہلایا کہ ایک دم سے میری آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا اور پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا۔

"اے ہے!" شاہدہ نے اور میں نے جھرجھری لیکر کہا۔ ہم دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "ڈاکو ہے کمبخت۔ پھر تو گھر کیسے آئی اور وہ موذی کہاں گیا؟"

حرم والی نے خود جھرجھری لیکر کہا "بہن کیا بتاؤں میرے اوپر کیا گذری۔ میری آنکھ کھلی تو سناٹا تھا میں پیچھے آئی۔ کوئی نہ تھا صرف مالی بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ معلوم ہوا ریست اور حجی شہر گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ تحمی کہاں ہیں۔ مالی کو جھٹ ساتھ لے گھر پہونچی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ ریست اور حجی دونوں لکھنو گئی ہیں۔ خاتون بھی کہیں نہیں گئی تھی اور مجھے اُس ڈاکو نے دھوکا دیا تھا"

"اور وہ ڈاکو کہاں گیا؟" شاہدہ نے پوچھا

"معلوم نہیں کہاں گیا؟" جم والی بولیں: "اور لطف یہ کہ برسوں جو جم کا خط آیا تو یحیی کی تعریفوں سے بھرا پڑا تھا۔ اب میں نے سب حال لکھدیا ہے"

یہ عجیب غریب قصہ جم والی نے سُنایا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہیں وہ تعلیم یافتہ مُہذب ڈاکو جنکو ایسی نئی تہذیب پر ناز ہے میں نے دل میں کہا۔ مجھے یہ آزادی اور اعتماد ایک خطرناک مگر خوبصورت بلا معلوم دی۔ کس طرح لوگ دوستی اور معصومیت کے پردے میں درندگی اور وحشیانہ مظالم کرتے ہیں۔ خدا کی پناہ ان گندم نما جو فروشوں سے خدا کا شکر اور لاکھ لاکھ شکر کہ بس اس طوفان میں پہونچی تو بعد شادی پہونچی۔ بیچاری جم والی چُپ ہو کر رہ گئی اور اُس نے ایسی نئی تہذیب کے دلدادہ بھائی سے بھی تذکرہ نہ کیا۔ یہ بھی اچھا ہوا ورنہ معلوم کیا سے کیا خبریں اُڑتیں۔ عورتوں کی آزادی واقعی بہترین چیز ہے۔ مگر کس حد تک؟ یہ سوال وقت خود حل کر لیگا مگر قبل اسکے کوئی معیار مقرر ہو واقعات رُونما ہونگے۔ اعتماد اور بھروسہ کا محل کس بنیاد پر قایم ہو؟ ایک آدہ دیوار کھسک کر ضرور بیٹھ جائیگی تب پتہ چلے گا کہ ہماری سوسائٹی کی بنیاد کہاں کھوکلی تھی درصل ہماری سوشل صلاح کے معمار کو نہ صرف محتاط ہونا چاہئے بلکہ اپنے فن میں ہوشیار بھی ہونا لازمی ہے جو لوگ اسکو صرف اور محض احتیاط کا سبق دیتے ہیں وہ شاید وقت صائع کر رہے ہیں کیونکہ محض احتیاط کا مطلب ہے کام روک دینا۔ مصداق ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز کام لازمی کرنا ہے۔

آلو کا بھرتہ
باب (۹)

شاہدہ کے ماموں کی شادی سے واپس ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ بی خاتون مجھ سے ملنے آئیں۔

دوپہر کا وقت تھا اور میں کھانا کھا کر پڑے پڑے بیٹھی ہی تھی کہ بی خاتون آ پہونچیں۔ اپنی حسب معمول سادگی کے ساتھ آج نہایت ہی پاکیزہ لباس پہنے ہوئیں اور جامہ زیبی کا یہ حال تھا کہ میری نظروں میں کھب کے رہ گئیں۔ انکی بڑی آنکھیں بشاش اور روشن چہرہ پر کسقدر خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ مسکراتی ہوئی اُتریں۔ میں نے لا کر کمرہ میں بٹھایا اور انکی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں میں نے غور سے انکو دیکھا کس نفاست سے بال بنائے ہوئے تھیں۔ نوک پلک سے اس طرح درست تھیں کہ میں نے کبھی انہیں اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ہنسکر کہا۔

"بی خاتون آج تو، خدا نظر بد سے بچائے دل میں گھسی جا رہی ہو"۔

بی خاتون اس توجہ سے خوش ہو کر مجھ سے محبت سے لپٹ گئیں۔ "میری بہن"! انہوں نے کپکپاتی ہوئی آواز سے کہا اور مجھے چھوڑتے ہوئے ایک گہرا اور بامعنی سانس لیا۔ وہ پھر اسی طرح پھول سی ہوئی تھیں۔ بجید! اے انتہا خوش۔ میں نے پھر اُن کی خوشی سے متاثر ہو کر کہا۔ "بہن میری طبیعت تمہیں اسطرح خوش دیکھکر باغ باغ ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم خوش ہو۔ کیا کوئی اور بات ہوئی"؟

خاتون کا چہرہ ایک دم سے جیسے مارے خوشی کے بھڑک اوٹھا۔ اونکی خوبصورت آنکھوں سے خوشی کے جیسے شرارے اُڑنے لگے۔ طبیعت میں جیسے ایک دم سے اس تذکرہ سے ہیجان سا پیدا ہوگیا اور چہرہ پر مسرت کی بجلیاں کڑکنے لگیں بس اطمینانِ قلب کا اُنکے رویہ سے اظہار ہو رہا تھا اور اپنے دلچسپ اور عجیب و غریب قصّہ کی کس طرح اُنھوں نے مجسم تمہید ہوکر مجھ سے کہا ہے۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری مصیبتوں کا اُس نے خاتمہ کیا۔ سب رنڈیاں اور شہدے آخر کو میں نے مار بھگائے ؟"

"کیسے آخر ؟" میں نے کچھ رُکتے ہوئے کہا کہ شاید حالِ دل بتانا پسند نہ کریں۔ کیونکہ کچھ بھی ہو مجھ سے اُن سے کافی تکلّف تھا۔ نہ تو میں اُنکی خدمت میں گُستاخ تھی۔ اور نہ آزاد۔

"تمہیں میرا پورا قصّہ نہیں معلوم ہے" بی خاتون بولیں "درصل بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ بات درصل یہ ہے کہ میری اور میرے میاں کی طبیعت میں کچھ مناسبت ہی نہیں کیں عیش و آرام سے میں گھر میں رہی میاں سے باہر اور پھر قسمت تو دیکھو کہ جیسے ہندوستان میں ہوتا ہے مجھے ایک عیاس اور ضرورت سے زیادہ اوباش کے سر تھوپ دیا اور پھر لُطف یہ کہ سب کچھ جانتے ہوئے یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ کس طرح مہینہ دو مہینہ کی مہمانداری کے بعد ہی وہ بات کا زمانہ آگیا۔ بڑے مکان سے ملا ہوا چھوٹا مکان ہے جس میں اکیلے پڑے رہنا اور گھُل گھُل کر مرنا میری قسمت میں لکھا معلوم ہوتا تھا۔ میاں کو گھر میں آنے کی قسم تھی۔ دن رات باہر ہی رہتے تھے اُن کے مُلازم علیحدہ تھے اور ان ہی ہیں۔ سوائے کھانے کے درصل سب الگ پچاس روپیہ باپ سے ملتا ہے لیکن والدہ صاحبہ کا یہ حال ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی ڈگریاں جھیکے سے چکاتی تھیں اور دو دو سو روپیہ ماہوار رنڈیاں لیجاتی تھیں میاں کا یہ حال کہ گھر میں کبھی آتے بھی تو تیری سے نکلے چلے گئے۔ ہوتے ہوتے یہ حال ہوا کہ ایک مرتبہ پورے سات مہینہ گذر گئے کہ صورت بھی دیکھنے میں

نہ آئی اور پھر مصیبت یہ مصیبت کے دروازہ سے چار قدم ہی پر بیٹھے رنڈیوں سے ہنسی مذاق ہوتا رہتا آن کا بندھا ہوا کھانا گھر میں سے آجاتا۔ اگر زیادہ منظور ہوتا تو اپنے ملازم سے الگ پکوا لیتے، پان یا دوسری چیز کی ضرورت ہوتی تو ماں سے منگوا لیتے ورنہ پھر بازار بھی باہر ہی موجود تھا قصہ مختصر یہ کہ میں یہ سب باتیں تم سے کہہ ہی چکی ہوں کہ اکیلی گھر میں پڑی کڑھا کرتی۔ ڈھائی تین برس اس طرح نکل گئے اور میری زندگی کو لالے پڑ گئے مگر مجھ سے بھی گھر نہ جانا تھی نہ گئی۔

سب سے زبردست غلطی لوگوں نے کہا میں نے یہ کی تھی کہ اپنا روپیہ انہیں دیدیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس دن سے اور بھی آنا میرے سامنے کم کر دیا بلکہ اس کے بعد سے ایک بات اور کر لی اور وہ یہ کہ غصہ ور صورت بنائے رہنے لگے یہ شاید اس وجہ سے کہ کہیں میری ہمت نہ پڑے کہ دل میں یہ خیال کروں کہ اتنا روپیہ دیکر کچھ انکی گردن جھکالوں گی مگر بخدا میں ذرہ بھر کبھی نہ پچھتائی انہوں نے سب کا سب رنڈیوں کو کھلا پلا کر برابر کیا یہ تو گویا ابھی ابھی کی بات ہے۔ کوئی پرانی بات نہیں۔ روپیہ جو پاس آیا تو رنڈیوں کو لیکر خوب خوب سیریں کرنے لگے میں نے صرف اتنا سنا تھا کہ کسی رنڈی کو لیکر کہیں باہر گئے ہیں۔ کئی روز ہو چکے تھے اور مجھے خیال ہی نہ تھا۔ یہ جبکا ذکر ہے جب تمہاری شادی ہوئی ہے۔ اس سے کچھ ہی پہلے کا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ رات کے بارہ یا ایک بجے ہونگے میں غافل پڑی سو رہی تھی۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا "ذرا اٹھو تو!" میں چونک کر اٹھ بیٹھی اور مارے خوشی کے میرا کلیجہ دھک دھک ہونے لگا گھبرا کر میں نے کہا "کہئے!"

"اماں جان کے یہاں سے کچھ کھانے کو ہو تو ذرا جا کر لا دو!" سر کھجا کر کہا۔ "دو تین آدمیوں کے لئے لانا اور ایسے جانا کہ کسیکو معلوم نہ ہو"

کیا بتاؤں میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا زہے قسمت کہ مجھ سے کوئی کام تو لیا۔ دبے پاؤں میں

بڑے گھر میں گئی اور جاکر باورچی خانہ اور نعمت خانہ سب ٹٹول مارا سوائے ایک سوکھی روٹی کے کچھ نہ تھا۔ اسی طرح چپکے سے لوٹ کر آئی اور احوال سنایا۔ میں بھیگی بلی کی طرح ڈر کے مارے چپ کھڑی ہوئی تھی کہ اتنے میں بولے "پھر کیا ہو باہر بھی کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ابھی پک جائیگا"

"مگر میں نہیں چاہتا کہ گھر کی ملازمہ سے کام لوں وہ اٹھ کر بڑبڑائے گی۔"

میں نے کہا "جی نہیں میں خود پکا دوں گی کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔"

"بڑی دیر لگے گی" انہوں نے کہا

میں نے جھٹ سے کہا "ابھی ابھی پکا دوں گی۔ آلو رکھے ہوئے ہیں۔ اور دو انڈے رکھے ہوئے ہیں آلو کی ترکاری اور انڈے کا خاگینہ بنا کر روٹی ڈال دوں گی"

کچھ سوچنے لگے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ یا اللہ کسی طرح اس بات پر راضی ہو جائیں۔ آخر کو بولے کہ "ذرا اچھی طرح پکانا۔"

"بہت اچھی طرح پکاؤں گی اور ابھی لیجئے" یہ کہہ کر میں سیدھی باورچی خانہ میں پہنچی۔ جلدی سے لکڑیاں جمع کر کے چولہے میں تیل ڈال کر چشم زدن میں آگ جلائی اور آلو جلدی سے چھیل کے کتر کے بہت سی پیاز اور گھی میں خوب اچھی طرح بھونے دودھ بہت سا رکھا تھا اور میں نے بجائے پانی کے کے خوب بہت سا بالائی دار دودھ ڈال کر پکائے آٹا جلدی سے گوندھا اور وہ بھی دودھ میں اور خوب بہت سا گھی ڈالکر پراٹھے پکا ہی رہی تھی کہ میری چھوٹی نند اٹھ کر آگئی میں اسے دیکھ کر مسکرائی وہ متعجب ہو کر کہنے لگی "آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"تمہارے بھائی جان کے لئے پکا رہی ہوں" میں نے کہا۔

حمیدہ بولی "ارے آپ غضب کر رہی ہیں بھلا یہ کس کے لئے پکا رہی ہیں آپکو معلوم نہیں ہے"

میں نے مسکرا کر کہا "ہاں معلوم ہے تمہاری دوسری بھابی جان کے لئے پکا رہی ہوں جو باہر بیٹھی ہیں۔"

"خدا کی مار اُن کمبخت پر۔ میں آپ کو اُس چڑیل کے لئے نہیں پکانے دونگی"۔ یہ کہکر اُسنے آٹا گھسیٹ لیا۔

"خدا کے لئے پکانے دو۔ آج میری قسمت جاگ اٹھی ہے جو مجھ سے انہوں نے اپنے ایک کام کو کہا مارے خوشی کے میری جو حالت ہے میں ہی جانتی ہوں"۔ یہ کہہ کر میں نے اُس سے آٹا چھین لیا اور "نہیں ذرا تم بھی پکوا لیتیں۔ تو مجھ سے خوش ہو جاتے کہ جلدی پکا لائی"۔

اُس نے کہا "بھابی جان آپ کا کام ہوتا تو میں کر دیتی۔ اُس چڑیل کے لئے تو میں ہرگز نہ پکاؤنگی"۔

میں نے ٹھنڈا سانس لیکر کہا "نہیں بس خدا نہ ڈالے وہ تو پھر بھی انسان ہے۔ اگر وہ شیطان کے لئے بھی پکوائیں تو میں پکاؤں اگر وہ بھنگی اور کتوں کے لئے مجھ سے پکوائیں تو میں پکا دوں۔ رونا تو یہی ہے کہ مجھ سے کام ہی نہیں لیتے۔ نہیں اگر میرے اوپر رحم آئے تو میرا ہاتھ بٹا لو شاید وہ اِس سے خوش ہو جائیں کہ میں جلدی سے پکا لائی"

میرے اس طرح کہنے پر اُسے رحم آگیا اور وہ کہنے لگی "میں تو کبھی نہ پکاتی۔ مگر لایئے آپ کی خاطر سے کر دوں"۔

میں نے خوش ہو کر کہا "نہیں اگر کرنا چاہتی ہو تو بس اتنا کرو کہ چولہے کے اُس طرف آنچ خالی نکل رہی ہے سویاں بھونی ہوتی ٹین میں رکھی ہیں جھٹ سے قوامی سویاں پکا دو"۔

میری خوش قسمتی تھی کہ اُس کی سمجھ میں کچھ آگیا اور وہ تیزی سے کام کرنے لگی میں نے جھٹ سے پراٹھے ختم کر کے دودھ کا چھینٹا دے کر الگ رکھے۔ آلو کی ترکاری اُتاری اور انڈوں کو دودھ اور بالائی میں ملا کر پھینٹا اور بہت سا گھی اور پیاز ڈال کر جلدی سے تل دیا۔ وہ کہنے لگی کہ "آپ ہر چیز میں دودھ ڈال رہی ہیں کہیں انڈوں میں بھی دودھ پڑتا ہے"؟

میں نے کہا پڑتا تو نہ انڈوں میں ہے اور نہ ترکاری میں مگر میں نے تو آج تجربہ کیا ہے۔ ملائی دار دودھ کسی میں ڈالو ضرور مزہ دے گا۔"
میں نے اُس سے کہا کہ "تم سویاں پکاؤ۔ میں ابھی کھانا دے کر آتی ہوں" قرینہ سے ایک سینی میں میں نے سب کھانا لگایا اور چھوٹے گھر میں آئی۔ دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹائی "بڑی جلدی پکالائیں" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ ہی پر سینی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں دوڑی ہوئی باورچی خانہ میں آئی۔ کچھ تھوڑے سے آلو کے قتلے پتیلی میں اور پڑے تھے۔ میں نے تیزی سے سل پر ان کو پیس کر چٹنی کی صورت میں بھرتہ تیار کیا۔ ادرک اور پیاز اور پودینہ جلدی سے ملا کر داغ کیا۔ اور ایک رکابی میں لیکر دروازہ پر پھر پہنچی کان لگا کر سُنا تو وہ رنڈی کہہ رہی تھی "میں نے عمر بھر میں کبھی اتنی خوش ذائقہ آلو کی بھجیا نہیں کھائی" یہ آواز میرے لئے کس قدر باعثِ خوشی تھی۔ بس کوئی میرے دل سے پوچھے۔ مارے خوشی کے میرا دل چلتے چلتے معلوم ہوا کہ رک سا گیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جو میں نے نہیں سُنیں کہ میں نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ کھانا چھوڑ کر دوڑے آئے۔ میں نے رکابی ہاتھ میں دی تو کہا "کچھ اور ہے؟ آج تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے" یہ کہہ کر رکابی لے لی۔ میں وہیں کان لگائے کھڑی رہی "یہ لیجئے بھرتہ بھی چکھئے" انہوں نے رنڈی سے کہا۔
"آخر یہ کون پکا رہی ہے؟" رنڈی نے پوچھا۔
"ایک نئی ماما آئی ہے" وہ بولے۔
"مجھے ایک ماما کی خود بڑی ضرورت ہے۔ اگر آپ یہ ماما مجھے دیدیں تو بڑی عنایت ہو" رنڈی نے کہا۔
"تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے" انہوں نے رنڈی سے کہا "میں دیدونگا بشرطیکہ

وہ جانے کو راضی ہوئی۔"

"راضی کیوں نہ ہوگی؟" رنڈی بولی۔

"میں تو جانتا ہوں راضی ہو جائے گی۔ میں دوگنی تنخواہ اسکو دونگا۔"

"بھرتہ بھی اس نے کمال کا پکایا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں نے عمر بھر نہ تو ایسا بھرتہ کھایا اور نہ ایسا انڈا کھایا اور نہ ایسی آلو کی ترکاری کھائی۔ اور نہ ایسے پراٹھے کھائے اور پھر طرہ یہ کہ چشم زدن میں سب چیزیں آگئیں۔"

غرض میری خوب خوب تعریفیں ہو رہی تھیں۔ اور میاں تعریفیں سن سنکر نہال ہوئے جاتے تھے۔ اور ادہر میں مارے خوشی کے بیدم ہوئی جا رہی تھی میں باتوں میں ایسی محو تھی کہ مجھے سویّوں کا خیال ہی نہ رہا کہ اتنے میں وہ رنڈی بولی" بس کوئی میٹھی چیز اور ہوتی تو لطف آجاتا۔"

"پہلے سے تم نے نہیں کہا۔ بھلا اس وقت کیا ہوسکتا ہے۔"

رنڈی نے کہا۔" میں نے تو یونہی کہا۔ واقعی بھلا اسقدر جلدی اور پھر اس وقت کیسے ممکن تھا"

میں ایک دم سے باورچی خانہ میں دوڑی، وہاں حمیدہ نے سویّاں تیار کرکے ایک کابی میں رکھی تہیں۔ خوش قسمتی سے میوہ کترا ہوا مل گیا تہا اس نے وہ بھی ڈال دیا تہا۔ میں پلیٹ لے کر سیدھی دوڑی ہوئی اپنے مکان میں تیر کی طرح آئی۔ پڑے پڑے دن رات کی فکر میں گھل گھل کر بیمار سی ہوگئی تہی۔ حکیم صاحب نے سیب کا مربہ سونے کے ورق میں لپیٹ کر کھانے کو بتایا تہا یہاں کس کو فکر جینے کی تھی یوں کا یوہی رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک سیب کو باریک باریک کتر کے اس کو سویوں میں ملا دیا اور اوپر سے سونے کا ورق اور اس کے گرد چاندی کے ورق لگا کر دروازہ پر پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹایا اوہہ کر کے

میاں اُٹھے اور آئے تو ذرا جھلا کر کہا کیا ہے "میں سہم سی گئی اور میں نے کہا "کچھ نہیں سوّیاں ہیں " ایک ہاتھ میں انھوں نے چمچے لئے اور دوسرے ہاتھ میں رکابی لی اور کیا بتادوں کہ کس لہجہ میں انھوں نے خوش ہو کر اس سے کہا "بولو کیا دلواؤ گی اگر ہم تمھیں تمہاری مرضی کی اس وقت ایک چیز کھلائیں ؟"

"تمھیں ہماری قسم " رنڈی نے کہا۔

وہ خوش ہو کر بولے " واللہ ابھی لو "

یہ کہہ کر انھوں نے رکابی رکھدی۔ کیونکہ فوراً ہی اس نے کہا " قسم کھا کر کہتی ہوں میں نے کبھی ایسی سوّیاں نہیں کھائیں "

وہ خوش ہو کر بولے " تمیز بھی ہے یہ مزعفر ہے "

میں برابر اپنے پکانے کی تعریفیں سنتی رہی اور وہاں یہ طے ہوا کہ اکثر اس ملازمہ کے ہاتھ کی چیزیں پکا کریں گی اور خاص طور پر آلو کی بھجیا اور بھرتہ میں نے جیسے ہی آہٹ سنی کہ کھانا کھا چکے ہیں ویسے ہی میں دروازہ سے ہٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد برتن لیکر آئے تو میں نے دبی زبان سے کہا۔ " آپ نے کیوں تکلیف کی، صبح کو آجاتے " میں نے ہاتھ سے برتن لئے تو انھوں نے خوش ہو کر میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے کہا " شاباش تم بڑی اچھی بیوی ہو " کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہو گیا جھٹ سے میں نے برتن تخت پر رکھدیئے اور اس ہاتھ کو پکڑ کر چومنے لگی میرا ایک دم سے دل بھر آیا اور ان کے ہاتھ پر گرم گرم آنسو گرے۔ شاید وہ گھبرا سے گئے کہ ایک دم سے نرمی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور یہ کہتے چلے گئے کہ " برتن اندر ابھی رکھ آنا " میں برتن لیکر گئی اور چولہا وغیرہ ٹھنڈا کر واپس چلی آئی۔

چارپائی پر لیٹی میں اس واقعہ پر غور کر رہی تھی۔ اور اس قدر خوش تھی کہ بیان ہی

نہیں کر سکتی۔ نہ معلوم کتنی دیر تک سوچ سوچ کر دل خوش کیا کی۔ میں دل میں کہتی تھی کہ مجھ سے زیادہ اور کون خوش قسمت ہو سکتا ہے۔ جب سے بیاہ کر آئی آج مجھ سے ایک کام کو کہا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ہو گیا۔ اور اچھی طرح اور سرخ روئی سے۔

اس روز جو تم ملی ہو اور شاہدہ نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں پریاں کیسی ناچ رہی ہیں تو واقعی اس کا کہنا ٹھیک تھا۔ میں اس وجہ سے خوش تھی۔"

میں یہ قصہ سنکر دنگ رہ گئی اور میں نے کہا "بہن تم نے واقعی کمال کیا شاباش ہے تمہیں۔ تمہارا ہی کام تھا جو تم نے یہ سب کچھ کیا۔ مشکل ہے کسی دوسری سے ہونا۔"

"مشکل کچھ بھی نہیں بہن پڑتا ہے تو کرتے ہی ہیں سب! ابھی کیا ہے ابھی اور سنئے صبح کا قصہ سنئے۔

(۲)

صبح ہوئی اور میں منتظر تھی کہ شاید آئیں۔ مگر تو بہ کیجئے دو تین روز نہ آئے خدا بھلا کرے اُس رنڈی کا کہ اُس نے پھر اُسی بھرتہ کی فرمایش کر دی۔ میری قسمت جاگی اور ایک روز صبح آئے۔ میرا خوشی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ اور میں نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ مسکرا کر کہنے لگے "جیتی رہو" میں دل میں خوش خوش چپکی کھڑی رہی کہ بولے "وہ جو بھرتہ اُس روز تم نے پکایا تھا!"

میں نے دبی زبان سے کہا "آپ کہیں تو آج پھر پکا دوں۔ وہ تو جلدی میں پکا یا تھا آپ کو پسند آیا؟"

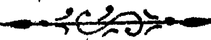
وہ بولے "ہاں بہت اچھا تھا۔ پرسوں پکوانا ہے مگر تھوڑا سا آج بھی پکا دینا۔ تاکہ اطمینان سے دیکھیں کہ کیسا پکتا ہے!"

"بہت اچھا ابھی پکاتی ہوں" میں نے خوش ہو کر کہا۔
وہ بولے "بس سویرے کھانے کے ساتھ بھجوا دینا"

بیویاں اپنی سوتوں کو زہر دیا کرتی ہیں اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ میری قسمت ہی عجیب تھی سے مجھے ایسی ناجائز سوت کو عمدہ کھانے کھلانے میں مزا آتا تھا اور میری عقل نہ کام کرتی تھی کہ کیونکر سوت کو زہر دے کر طبیعت خوش ہو سکتی ہے اچھا بھی ہو مجھے معلوم ہوا کہ ایک نایاب نسخہ میرے ہاتھ لگا ہے یعنی یہ کہ آلو کے بھرتہ میں دودھ اور بالائی ڈالنا۔ آج میں نے اور ہی ترکیب کی۔ چھٹانک بھر بالائی اور چھٹانک بھر بادام اور پستہ ڈالے۔ اور خوشبو کے لئے تھوڑا ناریل پیس کر ملایا۔ اور ان سب چیزوں کو ملا کر خوب پیسا۔ اس کے بعد آدھ سیر گوشت کی یخنی تیار کر کے آلوؤں کو اس میں دودھ ڈال کر ابالا اور سب پسی ہوئی چیزیں یعنی بالائی اور بادام وغیرہ میں ملا کر ایسا پیسا کہ یکجا کر لیا اس کے بعد بہت سے گھی میں پیاز سرخ کر کے بھرتہ کے تمام مصالحہ کے ساتھ دھیمی آنچ پر بھون کر اتار کر پودینہ وغیرہ ملا دیا۔ اب جو اس کو میں نے چکھا تو خود میری عقل حیران ہو گئی کہ یا الٰہی یہ کیا معجون مرکب بن گئی میں نے دل میں کہا کہ اس روز بھرتہ پراٹھے کے ساتھ کھلایا تھا۔ اگر آج روٹی ہو گی تو شاید کچھ ذائقہ دب جائے۔ لہٰذا میں نے دودھ اور گھی اور بچی ہوئی یخنی سے آٹا گوندھ کر پراٹھے بھی پکا لئے۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں بھی باہر گئیں۔

رنڈی نے جو کچھ تعریف کی وہ کی۔ خود میاں چکر میں آ گئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ کھانے کے بعد ہی آئے۔ چہرہ سے خوشی ظاہر تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ بیحد خوش ہیں۔ میں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ کھڑی ہو گئی تو میرے میلے جوتے پر نظر پڑی اور سب بھول کر ایک دم سے بولے "تم کیسا خراب جوتا پہنے ہوئے ہو" میں نے چپ ہو کر نظر نیچی کر لی۔ تو بولے "آج کا بھرتہ تو تم نے ایسا پکایا ہے کہ میں نے عمر

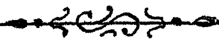
بھر نہیں کھایا۔ بھرتہ کیا تھا کہ نعمت تھی" "بس پرسوں بھی ایسا ہی ہوگا۔ مگر سیر بھر کا ہونا چاہیئے"
میں نے دبی زبان سے کہا "امی جان خفا ہو رہی تھیں کہ . . . . ."
"ہاں تم اپنے ہاں پکانا وہاں مت پکانا" یہ کہہ کر پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا اور کہنے لگے "یہ جو کچھ خرچ ہو اور بقیہ تمہارا انعام ہے" یہ انہوں نے مسکرا کر کہا۔
کیا بتاؤں میرا کیا حال تھا۔ رہے قسمت کہ مجھ سے مذاق تو کیا۔ مگر میں نے سوکھے منہ سے کہا "آپ کیوں کسی سے کوئی چیز باہر پکواتے ہیں۔ میرا انعام تو یہ ہے کہ پرسوں دعوت کیلئے کوئی اور چیز بھی مجھ سے پکوائیے"
"نہیں اور کچھ نہیں سب انتظام ہوگیا ہے۔ تم بھرتہ ہی پکا دینا" یہ کہہ کر اٹھ کر چلے گئے۔



میں نے دیکھا کہ یہ بھرتہ پکتا دیکھنے دوبارہ آچکے ہیں لہذا انہیں گر کی بات انہیں نہ معلوم ہو جائے جو سب حقیقت کھل جائے درحقیقت بھرتہ پکانے میں میرا ایسا ہنر تھا جو بھی تھی تو بادام پستوں اور بالائی وغیرہ کی۔ میں نے آج اور بھی محنت سے بھرتہ تیار کیا۔ اور آج چونکہ کیوڑہ اور زعفران کا چھینٹا جو اور دیدیا تو لطف ہی آگیا خوب خوب رنڈیوں اور رنڈوؤں اور لڑکیوں نے کھایا اور داد دی۔ کسی نے کہا کہ بادام پڑے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کھویا پڑا ہوا ہے کسی نے کہا کہ آلو نہیں بلکہ گوشت ہے۔ دو تین صاحبوں نے کہا کہ ہم خود ایسا پکوا سکتے ہیں۔ قصہ مختصر ایک دن مقرر ہوا کہ کسی دوسرے دعویدار کے یہاں سے بھرتہ پک کر آئے میری خوش قسمتی سے اس بھرتہ کا خوب قصہ چھڑا۔ مجھ سے آکر یہ سب کیفیت سنائی۔ تو میں نے کہہ دیا کہ خدا کے فضل سے آپ کی لونڈی جیسا پکائے گی کسی سے نہ پکے گا۔ ایسا ہی ہوا کہ بھرتہ آیا اور سب نے کھایا اور سب نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی بی بی باورچن سے اچھا کوئی نہیں پکا سکتا۔ مجھے خود دکھایا تو مجھ

یہ معلوم ہوا کہ بادام ڈالے گئے ہیں اور کھویا ڈالا گیا ہے مگر گوشت کی یخنی کا ذائقہ اور ناریل کی خوشبو موجود نہ تھی۔ اور علاوہ اس کے معمولی مصالحوں کی طرف غیر توجہی برتی گئی تھی اور پھر طرّہ یہ کہ پراٹھے نہ تھے۔

قصّہ مختصر تین جگہ سے یک کر آیا اور سب کو شکست ہوئی۔ ایک جگہ سے گوشت پسا ہوا ملایا گیا جو سب کو معلوم ہو گیا۔



جُوتے میں وہی پہنے ہوئے تھی اور نتیجہ اس خدمت کا یہ ملا کہ ایک روز شام کو دو تین جوڑی جُوتے بھجوائے کہ اس میں سے ایک پسند کر لو اب یہ دستور رہا کہ جس روز بھُرتہ بجتا تھا تو اندر آتے تھے یا کسی دوسری جگہ سے بھُرتہ آتا تھا تب آتے تھے۔ ورنہ نہیں آتے تھے۔ میری بدقسمتی سے بھُرتہ کا خبط بھی لوگوں کو ہفتہ بھر سے بند تھا اور وہ بالکل ہی نہ آئے تھے میں پژمردہ ہو رہی تھی۔ اور میں نے یہ کہکر جُوتے واپس کر دیئے کہ رہنے دیجئے میرے پاس ہیں نامعلوم مُلازمہ نے جاکر کیا کا کیا کہا کہ خود اندر آئے اور کہنے لگے "اِن جوتوں میں سے ایک پسند کر لو"

میں نے حسبِ معمول دبی زبان سے کہا "میرے پاس دو جوڑی جُوتے رکھے ہیں"

ذرا تیزی سے بولے "ہائیں! تو پھر پہنتی کیوں نہیں ہو؟"

"میرا دل ہی نہیں چاہتا کہ کوئی اچھی چیز پہنوں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مت پہنو جُوتے لے میں جاؤ بھاڑ میں پڑو" یہ کہہ کر غصہ میں اُٹھ کر چل دیئے۔

ایک لمحہ بھر تو میں سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی۔ ایک دم سے مجھے رونا آگیا۔ نہ معلوم دل میں کیا سمائی کہ میں دوڑی وہ دروازہ کے پاس ہی تھے کہ میں نے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے کہا "معاف کیجئے۔ میں ابھی پہنے لیتی ہوں"

شاید دل پسیج گیا۔ میں نے روتے ہوئے اوپر منہ کر کے دیکھا تو مسکرا کر کہا "اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ پہن لو" میں واپس آئی اور دیر تک روئی کی۔ میں نے اُن جوتوں میں سے ایک رکھ لیا اور دو باقی واپس کر دیئے۔

(۳)

بھرتہ کا قصہ بالکل ہی سر دپڑ گیا تھا۔ اکثر کیا بلکہ رات کو ہمیشہ گھر سے غائب ہی رہتے تھے۔ لیکن کسی روز ایسا بھی ہوتا تھا کہ میری قسمت جاگتی تھی جو وہ رنڈی گھر پر رہتی تھی اور اس روز مجھ سے بھرتہ کی فرمائش ہوتی تھی۔ اب میری عادت سی ہوگئی تھی کہ جس روز وہ آتی ضرور دروازہ پر کان لگا کر باتیں سنتی۔

ایک روز وہ آئی اور میں نے اُس کے لئے علاوہ بھرتہ کے دو تین چیزیں خود اپنی مرضی سے پکائیں اور سب چیزوں میں اپنے خاص نسخہ اور ترکیب سے کام لیا تھیں تو بہت تھوڑی تھوڑی۔ مگر بیحد خوش ذائقہ تھیں۔

میں نے دروازہ پر کان لگائے تو کھانا کھاتے ہی میں مجھے باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ اس روز سے تقاضا کر رہی ہے کہ پکانے والی کو مجھے دیدو۔ چنانچہ۔ اس نے کہا کہ "یہ بھی کوئی بات ہے کہ آج کل کر رہے ہو۔ آخر اس نوکرانی کو مجھے دے کیوں نہیں دیتے" یہ کہہ کر اس نے دیر تک نہ معلوم کیا کیا باتیں کیں اور بڑبڑایا کی اور نہ معلوم کیا کیا جواب ملے۔ لیکن آخر کو اس نے وعدہ لے ہی لیا کہ کل ضرور اسکو یہ بھرتہ پکانے والی مل جائے گی۔ میں نے دل میں کہا یا الٰہی کیا سچ مچ مجھ اس رنڈی کو دیدیں گے؟ اگر واقعی خوش ہو جائیں تو مجھ کو یہ بھی منظور ہے۔ اتنے میں کھانا ختم ہوا اور میں جھٹ پٹ کھسک چلی آئی کوئی آدھ گھنٹہ بعد پھر گئی تو وہاں پھر وہی ذکر تھا کہ بھرتہ پکانے والی کو کل ضرور ضرور لاؤ۔ وہ یہ کہہ کر اُٹھے کہ "میں ابھی دریافت کر کے بتاتا ہوں کہ کل اُسے بھیجا اسکو گا یا پرسوں" میں

یہ سُنکر گھبرا گئی۔ مگر دوڑ کر اپنی چارپائی پر برآمدہ میں بیٹھ گئی۔ گھر میں کوئی نہ تھا میں نے دیکھا کہ وہ سیدھے میرے پاس آئے میں کھڑی ہوگئی مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہے میں اسی طرح مودبانہ طریقہ سے کھڑی تھی کہ پھر مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ" میں بیٹھ گئی لیکن میرا دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ کچھ سکون کے بعد کہا "میں تم سے ایک بات کہتا ہوں۔"

میں چپ اسی طرح کھڑی رہی کہ وہ بولے "میں کل ایک نوکرانی بُلاؤں گا اُسے تم بھرتہ پکانا سکھا دینا۔"

"میں خود پکانے کو حاضر ہوں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں۔" کچھ جھلّا کر کہا "تم سے جو کہتا ہوں وہ کر دینا۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا "اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" یہ کہہ کر میں ذرا قریب بڑھی اور وہ کھڑے ہوگئے۔ میں نے ہمت کر کے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور کمر میں دونوں ہاتھ ڈالکر بغل میں منہ دیکر رونے لگی محض چند ہی لمحہ گوارا کیا کہ اپنے کو یہ کہکر چھڑا لیا "خوب اچھی طرح سکھا دینا۔" میں آنسو پونچھتی کھڑی ہوگئی اور وہ چلے گئے مگر یہ خوشی تھی خدا کی شان ہے کہ کہاں تو صورت دیکھ کر ہی چڑ جاتے تھے۔ اور اب مجھ کو اتنی گستاخی کی اجازت اور کچھ نہ کہا میں دل میں سوچا کی کہ اس کی مرتبہ کچھ دل کی بات بھی کہو نگی۔

(۴)

مجھ سے سب ہی نے تو کہا کہ تو بھرتہ کی ترکیب نوکرانی کو مت سکھا۔ مگر میں نہ مانی بار بار غور کیا اور سوچا اور تیار بھی ہوگئی کہ نہ بتاؤنگی۔ مگر پھر یہی خیال آیا کہ انہوں نے تاکید سے کہا ہے اسے سکھانا کہ کوئی شکایت نہ ہو میں نے آخر طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو۔ میں تو اپنے میاں کو دھوکا نہ دونگی جو قسمت کا ہوگا وہ ویسے ہی سامنے آکے رہیگا۔ میں نے خوب اچھی طرح اس نوکرانی کو ترکیب بتادی

لیکن یہ ضرور اس سے کہہ دیا کہ حتی الامکاں تو اس کی ترکیب کسی کو نہ بتانا۔ قصہ مختصر یہ ملازمہ سکھا پڑھا کر یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ یہی بھرتہ پکانے والی ہے۔

پہلے روز اس نے بھرتہ یوں بگاڑا کہ بادام چھیل کر نہ ڈالے اور کڑوا کر دیا۔ دوسرے روز جو اس نے پکایا وہ ذرا جل گیا کیونکہ دھیمی آنچ پر نہیں پکایا گیا۔ تیسرے روز جو اس سے مختلف سوال کئے گئے تو بھانڈا پھوٹ گیا کہ اصل پکانے والی کے بجائے دوسری عورت بھیج دی گئی ہے۔ آئی گئی آفت میرے سر عجیب طرح آئی۔ رنڈیوں کے نخرے اور فرمائشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے چوچلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محض اس بات پر وہ اتنی بگڑی کہ نہ معلوم یہ سچا ہو کر رات ہی کو چلے آئے یا اس نے نکال دیا۔ قصہ مختصر رات کے بارہ بجے میرے اوپر آکر پھٹ پڑے۔ میں سو رہی تھی کہ مجھ کو جگایا اور ترش لہجہ میں کہا "کیوں جی ہم نے تم سے کیا کہا تھا؟"

میں کانپ رہی تھی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کس بارہ میں؟"

"تم نے شاید اس عورت سے کہدیا جو اس نے وہاں جاکر کہدیا کہ میں تو بالکل نئی ہوں۔ اور مجھے ایک دوسری عورت نے بھرتہ پکانا سکھا کر بھیجا ہے۔"

وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور میں کھڑی تھی میں نے ایک دم سے بیٹھ کر پاؤں پکڑ لئے اور کہا "آپ کے قدموں کی قسم جو میں نے ذرہ بھر سکھایا ہو۔ خدا مجھے آپ کی خدمت نہ نصیب کرے جو میں نے ذرا بھی اس کو کسی طرح ورغلایا ہو۔"

ذرا دیر چپ رہے۔ پھر پلنگ پر میرے ہاتھ سے اپنے پیر چھڑا کر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کے لیٹ گئے۔ میں اسی طرح کھڑی تھی کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے "وہ عورت بالکل گدھی ہے میں نے اسکو کس کس طرح سمجھایا تھا اور پانچ روپے انعام دیا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے کہدیا۔"

میں از راہِ ہمدردی یہ سنکر اس عورت کو بُرا بھلا کہہ کر کوسنے لگی کہ خدا کرے اسکو اس دغا بازی کا اجر ملے۔ پھر چُپ پڑے رہے۔ برسات کا زمانہ تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اُنہیں نیند آرہی تھی کیونکہ بڑی دیر سے بالکل اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ میں کھڑے کھڑے تھک گئی تو آہستہ سے پلنگ کی پائینتی آکر زمین پر بیٹھ گئی اور ہمت کر کے دھیرے دھیرے پاؤں دابنا شروع کئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاگ رہے تھے کچھ کلبلائے پھر تو میں پائنتی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور اچھی طرح پاؤں داتی رہی حتیٰ کہ وہ سو گئے میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ہٹوں اور یہی جی چاہتا تھا کہ پاؤں نہ چھوڑوں خدا کی شان تھی کہ وہ اس کے روادار تھے۔ اور میرے لئے اس سے زائد خوش قسمتی کا بھلا اور کون موقعہ ہوسکتا تھا۔ قصہ مختصر میں نے اُسی طرح پاؤں داتے رات کاٹ دی اور مجھکو ذرہ بھر تکان یا نیند نہ معلوم ہوئی بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وقت جلدی گذر گیا۔ صبح آنکھ جو کھلی تو کلبلا کر اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "ارے تم سوئے نہیں گئیں" میں بھلا اس کا کیا جواب دیتی جو تہ وہ دوسری طرف دیکھنے لگے میں نے اُٹھا کر پائنتی سے پاؤں میں پہنا دیا میں نے آنکھ کے گوشہ سے صرف اتنا چرا کر دیکھا کہ میرے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جوتہ پہن کر سیدھے باہر چلے گئے۔

(۵)

دو روز ہوگئے تھے اور چُپ سناٹے میں پڑے تھے میں بار بار خبر منگاتی معلوم ہوتا کہ چارپائی پر مغموم پڑے ہوئے ہیں۔ کیا میں خوش تھی کہ رنڈی سے لڑائی ہوگئی؟ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرا کیا حال ہوگیا۔ خوش میں ضرور تھی لیکن رنجیدہ بھی تھی۔ مجھے یہ خیال تھا کہ اُن کی خوشی کا سلسلہ گیا اور لہذا اب جو مجھے خوشی کی امید ہو چلی تھی وہ بھی منقطع ہوگئی اس رنڈی نے صاف کہلوا دیا تھا کہ اگر مجھ سے محبت ہے تو اصل بھرتہ پکانے والی نوکرانی کو دو اُنہوں نے کہدیا تھا کہ بوجوہ چند وہ نہیں مل سکتی۔ آخر کو رنڈی ہی ہاری اور ہار کر اس نے کہلوا بھیجا۔ کہ میں اپنی ضد چھوڑ دوں گی بشرطیکہ روزانہ مجھے

بھرتہ بکواکر بھجوا دیا کریں۔ میں دروازہ پر کھڑی سن رہی تھی اور اس کا جو جواب انہوں نے دیا وہ ایک بیاہتا بیوی کو خوش کر دینے والا تھا۔ ایک دم سے ڈانٹ کر اس کے نوکر سے کہا "نکل جاؤ یہاں سے اور کہدینا کہ اگر ان کو ضد کرنا آتی ہے تو ہم بھی بڑے ضدّی ہیں" بجائے نکل جانے کے اس کمبخت نے رنڈی کی ماں کی طرف سے پیغام دیا کہ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کے فراق میں لڑکی کا برا حال ہے۔ مگر کمبخت اپنی ضد نہیں چھوڑتی۔ آپ کے لئے روتی بھی ہے۔ مگر ضد بھی کرتی ہے اور بڑی مشکل سے سمجھانے بجھانے سے اب اتنا راضی ہوگئی ہے کہ کہتی ہے کہ روزانہ بھرتہ پکواکر بھیج دیا کریں"۔ مگر وہاں ایک "نہیں" اس کا جواب تھی۔ وہ آدمی آخر شش جھک مار کر چلا گیا۔



میں بڑی متفکر تھی کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ اور دوسرے روز جب میں نے دیکھا کہ وہ کمبخت اپنی ضد پر بدستور اڑی ہوئی ہے تو آخر کو ہار کر میں نے جلدی جلدی بھرتہ تیار کیا اور چپکے سے ان کے خاص ملازم سے رنڈی کے گھر بھجوایا۔ گھر کے ملازم جتنے بھی ہیں وہ دل سے میرے ہمدرد ہیں اور وہ بیچارہ بغیر کچھ کہے سنے دے آیا۔ یہاں ان کو تو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ ویسے ہی اٹوائی کھٹوائی لئے ہوئے پڑے تھے اور وہاں اس کی جو ضد پوری ہوئی تو وہ خود رات کو چلی آئی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر کوئی بات نہ سنائی دی۔ دوسرے روز بھی میں نے بدستور چپکے سے بھرتہ بھیجدیا اور تیسرے روز بھی ایسا ہی کیا میری طبیعت خوش ہوگئی کہ وہ پھر ہنسا س بشاش گھومنے لگے اور ایک مرتبہ مجھ سے بات بھی کی۔

چوتھے روز شاید وہاں ذکر ہوا ہوگا جو ان کو معلوم ہوگیا کہ شکست دراصل انہیں ہوئی ہے۔ اب تک وہ اسی بھول میں تھے کہ میری ضد پوری ہوئی ہے سیدھے میرے پاس آئے میں سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے میں نے ملازمہ سے اشارہ کر دیا وہ دروازہ بند کرتی ہوئی بڑے مکان میں چلی گئی

اور مکان اکیلا ہو گیا آ کر پلنگ پر بیٹھ گئے اور حسبِ عادت نہایت تُرش روئی سے کہا "یہ تم تیں رور سے بھرتہ بھیج رہی ہو؟"

میں ڈر کے مارے کانپ رہی تھی اور اپنی خطا کا اقبال کرتے ہوئے کہا "جی"

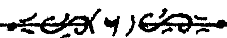
"کیوں؟ آخر کیوں" نہایت ہی دسگ آواز میں غصہ سے میری طرف دیکھ کر کہا کہ "آخر مجھ سے بغیر پوچھے یہ تم نے بھیجا ہی کیوں؟"

"آخر کیوں؟ کیا سمجھ کے تم نے بھیجا" رور دے کر مجھ کو ڈانٹا۔

"اس لئے" میں نے رُکتے ہوئے کہا "اس لئے کہ کہیں آپ کی طبیعت نہ خراب ہو جائے"

"تمہاری بلا سے" وہ جھنجھلا کر بولے۔

میں نے ایک دم سے رور سے کہا "خدا کے لئے خدا کے لئے مجھے معاف کیجئے میرا قصور معاف کیجئے" یہ کہتی ہوئی میں روتی ہوئی اُن کے قدموں کی طرف جھکی اور پیر پکڑ کر سر رکھ دیا تھوڑی دیر تک کچھ نہ بولے۔ پھر میرا سر سیدھے ہاتھ سے اُٹھا کر دیکھنے لگے مسکرا کر کہا "بیوقوف ہیں تو" شاید ان الفاظ میں لوٹے محبت تھی کہ میں بیتاب ہو گئی اور اُن کے گھٹنے پر سر رکھ کر اس بُری طرح روئی کہ مجھے اُسی حالت میں چھوڑ کر شاید گھبرا کر چلے گئے درصل بات یہ تھی کہ اس نامُراد رنڈی سے بے طرح اُن کا دل ملا ہوا تھا کہ کسی طرح اس کو بھولتے ہی نہ تھے میں درصل دل ہی دل میں اب خوش تھی کیونکہ حالات بڑی تیری سے بدل رہے تھے اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید میرے دن پھرنے والے ہیں۔



ادھر بھرتہ کا جورا رکھلا تو پھر ناچاقی ہو گئی اور گھر نہ جانا بند ہو گیا تیں چار روز میں نے انتظار کیا میں نے ارادہ کیا کہ باہر دیوان خانے میں آج رات کو ضرور جاؤں گی چنانچہ میں نے خدمتگار

سے چپکے سے کہلوا دیا کہ آج تو اجازت لیکر گھر چلا جاؤں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔



میں نے ڈرتے ڈرتے باہر قدم رکھا۔ کیونکہ اس سے قبل ایک مرتبہ ایسا کرنے پر میری وہ جھڑکی جا چکی تھی کہ خدا کی پناہ۔ میں نے دیکھا کہ ادھر ادھر کوئی نہیں ہے حقہ پی چکے تھے۔ اور ایک ہلکی سی ململ کی دُلائی اوڑھے ہوئے مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں ایسے دبے پاؤں گئی کہ آہٹ تک نہ ہوئی قریب پہنچکر میں نے مچھر دانی کا کنارہ اُٹھایا تو چادر منہ سے ہٹا کر بولے "کون ہے" میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور کچھ نہ بولی۔ کیونکہ انہوں نے دیکھ ہی لیا تھا پھر اسی طرح منہ ڈھک لیا میں ہمت کرکے پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی اور اپنا شغل شروع کیا تھوڑی دیر بعد سرک کر میں اچھی طرح بیٹھ گئی اور پاؤں دباتی رہی۔ آخر کو ہمت کرکے میں نے کہا "میں کچھ کہنا . . چاہتی ہوں"

"کیوں؟ کیا ہے" چادر کو منہ سے ہٹاتے ہوئے پوچھا مگر میں چپ رہی تو پھر کہا "آخر کچھ کہتی ہی ہو"

"آپ خفا تو نہ ہو نگے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"آخر کیا ہے کچھ کہو تو"

"میرے اوپر رحم کیجئے" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "آپ خوش ہوتے ہیں تو یہ سمجھ کر آپ خوش ہیں میں بھی خوش ہو جاتی ہوں۔ آپ کیوں اپنے دل کو رنج دیتے ہیں؟"

اس کا جواب انہوں نے دیا "ہشت"

میں نے مزاج کی نرمی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا "مجھ بد قسمت کا کیا ہے۔ آپ خفا ہولیں گے میں بھگت لونگی۔ جو چاہے میرا حال کیجئے گا"

"تو اس سے مطلب یہ ہے کہ کل سے پھر ٹھہر تے سہیجو گی" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں" میں نے کہا "خواہ کچھ ہی ہو آپ کا رنج تو دور ہو گا۔"
اُنھوں نے نرمی سے کہا "نہیں مت بھیجنا۔"
"پھر آپ رنج کریں گے۔" میں نے سادگی سے کہا۔
اس کا جواب پھر اُنھوں نے دیا "نہیں۔" اور کچھ ٹھیر کر کہا "جاؤ تم سو رہو۔" میں نے کچھ تامل کیا تو پھر یہی کہا کہ "جاؤ اندر جاؤ۔" اور پھر اس لہجہ میں کہا کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں تیز نہ ہو جائیں۔ میں بادلِ ناخواستہ اُٹھی اور اٹھتے اُٹھتے ایک کشش سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے ہتھیلی کو داتی رہی اور چوم کر بے اختیار آنسوؤں سے تر کرتی رہی کہ اُنھوں نے پھر کہا "اب جاؤ۔" بس سیدھی چلی آئی اور دیر تک خوشگوار خیالات میں محو رہی پھر سو گئی

دوسرے روز صبح کو میرے اوپر خاص عنایت یہ ہوئی کہ باہر جو پاندان رہتا تھا وہ اندر میرے پاس بھجوا دیا گیا۔ قمیص میں ٹانکے ٹانکے کو بھجوائے گئے۔ گو خود نہ آئے کیونکہ عادت ہی باہر رہنے کی پڑی ہوئی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ آج تو بالکل ہشاش بشاش ہیں۔



رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے اور میں سو رہی تھی کہ دروازہ پر زور زور سے کسی کے ہاتھ مارنے کی آواز سنی میں چونک پڑی۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ یہ دروازہ تو رات بھر کھلا رہتا ہے کس نے بند کیا۔ ایک دم سے میں اُٹھنے کو ہوئی کہ ملازمہ کو جگاؤں کہ برابر والے پلنگ پر سے آواز آئی "ہوں! رہنے دو۔" میں نے جلدی میں دیکھا بھی نہ تھا کہ کون بیٹھا ہوا ہے میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ "آپ کھڑے پر نہ بیٹھیں۔" اس کے جواب میں اُنھوں نے خاموشی کا اشارہ کیا کہ فوراً ہی پھر دروازہ پر کسی نے ہاتھ مارا اور زنانی آواز میں پکارا "کھولو۔" یہ واقعہ تھا کہ وہ رنڈی آئی ہوئی تھی اور اب یہ خود خفا ہو کر اندر دروازہ بند کر کے آ بیٹھے تھے۔ میں ہو چکی کھڑی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں سنتے میں پھر دروازہ پر بڑے زور زور سے

اُس نے ہاتھ مارا اور چلائی تو میں نے دبی آواز سے کہا "خدا کے واسطے آپ چلے جائیے ورنہ ..."
"چُپ رہو" انھوں نے مجھ سے ڈانٹ کر کہا اور سیدھے دروازہ پر جاکر زور سے کہا "نکل جا چُڑیل تو میرے یہاں سے ورنہ پولیس میں دیدونگا" ساتھ ہی نوکر کو اندر ہی سے آواز دیکر کہا کہ اِسے جلدی نکالو نوکر نے تھوڑی دیر بعد آکر کہا کہ "وہ نہیں جاتیں اور یہیں سو رہی ہیں"۔ "مرنے دو حرام زادی کو" یہ کہہ کر چلے آئے۔

جب ذرا طبیعت سکون پر آئی تو میں نے اصرار کرکے پلنگ پر لیٹا یا اور گرمی تھی لہذا پنکھا جھلنے لگی پانی مانگا تو اتفاق سے برف موجود تھی۔ میں نے شربت کیوڑہ کا گلاس بنا کر پلایا اور اسی طرح پھر پنکھا جھلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں طبیعت بالکل درست ہوگئی میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے ایک دم سے ہاتھ اُٹھا کر پنکھا روکا اور مجھ سے بہت محبت سے کہا "یہاں بیٹھ جاؤ" میں پٹی پر بیٹھ گئی اور پنکھا جھلنے لگی۔ میرے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کر اُٹھ بیٹھے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا "بیوی"! میں اُسی طرح دیکھ رہی تھی مگر میری عجیب ہی حالت تھی کہ پھر کہا "بیوی میں نے جو کچھ بھی تمہارے اوپر ظلم کئے ہیں، معاف کردو"

میرے اوپر ایک بجلی سی گری۔ ایک چیخ میرے مُنہ سے بے ساختہ نکلی اور میں بیہوش ہوکر گری۔
ہوش جو آیا تو دیکھا کہ وہی ظالم میاں جو کبھی خود مجھ سے پنکھا جھلواتے تھے آج خود مجھے پنکھا جھل رہے ہیں میں نے کمزور ہاتھوں سے روکنا چاہا مگر میرے اوپر وہ رقت طاری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید مرجاؤں گی۔

(۸)

صبح ہونے سے پہلے ہی وہ نامراد رنڈی سونے کی گھڑی اور کچھ روپے جیب سے نکالکر بھاگ گئی۔ اُس نے بعد میں لاکھ کوشش کی مگر بیکار اُس سے ملنے تک کے روادار نہیں اب پندرہ بیس روز

سے دُنیا میں اگر کوئی ہمدم اور جلیس ہے تو میں جب سے نہ تو اُنہوں نے اپنے پُرانے بدمعاش دوستوں سے ملاقات کی اور نہ کسی رنڈی سے۔

بہن خواہ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو عقیدہ ہے کہ ذرا سے بہانہ پر میاں نے جو اپنی داشتہ عورت کو چھوڑ دیا تو محض اس وجہ سے کہ چھوڑنے سے پہلے میں نے اُن کے دل میں گھر کر لیا اُن کے سامنے دو عورتیں تھیں جو بالکل مختلف تھیں اور اِس سے پیشتر اُن کے سامنے صرف ایک ہی فاحشہ عورت تھی میرے علم میں ایک دو نہیں بلکہ دس یا پانچ ایسی ہیں جنہوں نے صدہا میاں کا بازاری اور داشتہ عورتوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایسی عورتوں کو زہر دیا نتیجہ خود ظاہر ہے۔ خواہ مخواہ شوہر کو اس عورت سے زیادہ اُلفت ہو جاتی ہے جو نام نہاد محبت کے پیچھے زہر یا دوسری سختیوں کا شکار بنتی ہے۔ میاں دل میں سوچتا ہے کہ یہ میری محبت میں ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھا رہی ہے۔ حتیٰ کہ زہر تک اُسے دیا گیا ہے۔ لہذا یہی قابلِ پرستش ہے۔"



میں نے بی خاتوں کا یہ عجیب و غریب قصہ سُنا میں تصویرِ حیرت بنی ہوئی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ صبر اور استقلال کا ایک مجسمہ میرے سامنے تھا جسکے سنگین ارادوں نے کس ہمت سے ایک طوفان کا مقابلہ کیا اور زہر شیطن کو شکست۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عورت احسن التقویم کی تفسیر ہے تو مرد اسفل السافلین مجسم! لیکن ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ اس وحشیانہ سلوک کے لئے نہ تو عورت کی تخلیق ہوئی ہے اور نہ کسی مذہب نے عورت کو یہ درجہ دیا ہے مسلمانوں میں تو سوال اب یہ ہے کہ کیا اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے یہ سُلوک اور یہ واقعات ممکن تھے! نہ تو یہ واقعات اس زمانہ میں ممکن تھے اور نہ گوارا کئے جا سکتے تھے مگر اب البتہ یہ معاملہ ہے کہ ہر اُس شخص کی یہی مرضی ہے جس کے مُنہ پر ایک مشت اور چار انگشت خدا کا نور موجود ہے کہ میں بھی

اسی طرح آلو کا پٹھہ کہاؤں، یہ وہ ذلت ہے جس کے برداشت کئے بغیر ہندوستانی لڑکیاں کی نہ تو زندگی بسر ہو سکتی ہے اور نہ وہ خوش رہ سکتی ہیں ع تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو۔ جس قوم میں عورت کا یہ درجہ ہو ظاہر ہے کہ اسکی اخلاقی حالت کیا ہوگی۔

میں نے بی خاتون سے کہا "بہن تم نے واقعی کمال کیا۔ مگر کیا ٹھیک ایسے آدمی کا!" "کیا ٹھیک!" بی خاتون نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "بہن اب تو میرا پلہ بھاری ہے۔ بس آنکھیں کھلنے کی دیر تھی۔ میں نے آنکھیں کھولدی ہیں۔ ناز اری محبت ایک کھوٹی چیز ہے کب تک چلتی!"



دیر تک تفصیل سے بی خاتون باتیں کیا کیں اور اپنی کتھا سنانے کے بعد بقول کسے "آمدم بر سرِ مطلب" یعنی شاہدہ کا تذکرہ انہوں نے چھیڑا۔ میں نے اُن سے صاف صاف کہدیا کہ "بہن میں تمہارے اصول کے خلاف ہوں۔ شاہدہ کا مزاج اور تمہارا مزاج اور زمین آسمان کا فرق ہے تم تو بھٹکے ہوئے ہو آخر وہ رشتہ کس کام کا کہ فریقین میں کشاکش ہو۔ شاہدہ یہ رشتہ قطعی پسند نہیں کرتی اور نہ کوئی صورت ہے کہ وہ راضی ہو جائے۔ یہ بات اور ہے کہ اُس کے ساتھ زبردستی کیجائے" بی خاتون نے میری باتوں کو غور سے سُنا۔ میری رائے سے اتفاق بھی کیا مگر اپنے مقصد کے فلسفہ کو کسی دوسری طرح سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بتایا کہ انکی کوشش حق بجانب ہے اور یہ کہ شاہدہ کی مخالفت محض خیالی توہمات پر ہے جو بعد شادی فوراً ہی جاتی رہیگی۔ مجھ سے اُنہوں نے خواہش کی کہ اس معاملہ میں عملی امداد سے کام لوں لیکن میں نے صاف کہدیا کہ "بہن اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ بدقسمتی سے شاہدہ جب تک راضی نہیں میں بھی اس کی ہم خیال ہوں!"

اُنہوں نے سُنایا کہ پیام دے بھی دیا گیا۔ وعدہ بھی ہو گیا شاہدہ کے والد صاحب نے

وعدہ توکیا ہے مگر پختہ جواب نہیں دیا ہے وہ بھی مل جائیگا کچھ صلاح مشورہ کے بعد۔ اوراس دوران میں اُن کی مرضی تھی کہ ہر چہار طرف سے مخالفت کا امکان جاتا رہے۔

چلتے چلتے کہتی گئیں کہ شاہدہ کو سمجھانا بجھانا ہیں نے پھر زور دیکر کہدیا کہ "شاہدہ اگر راضی ہوجائے تو بہتر ہے ورنہ شاہدہ کی ملنے والیاں شاہدہ سے پہلے مخالفت کریں گی اور جو اُن سے بن پڑے گا کریں گی۔"

ہنستی ہوئی بی خاتون آئی تھیں اور اسی طرح ہنستی ہوئی چلی گئیں۔



باب (۱۰)
فیروزہ

(۱)

"فیروزہ!" مولانا کے مُنہ سے نکلا۔

"زاہدہ"! میرے مُنہ سے نکلا۔

میرا ہاتھ خود بخود تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے مولانا کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے میری طرف میں تصویر کی طرف دیکھنے لگی اور وہ زمین کی طرف۔

یہ کس کی تصویر تھی؟ میری پیاری سہیلی۔ میری تنہا رازدار اور غمگسار زاہدہ یا فیروزہ اور مولانا کی اصلی منسوبہ کی تصویر تھی ہم دونوں میاں بیوی شرمندہ تھے کنکھیوں سے میں نے مولانا کے سنجیدہ مگر خوبصورت چہرہ کو دیکھا . . ایک دم سے مجھے کچھ ناقابل بیان تکلیف سی ہوئی۔ کیونکہ وہ افسوس کر رہے تھے۔ ضرور افسوس کر رہے تھے۔ اور وہ بھی اسوجہ سے کہ اُنھوں نے خود ہی فیروزہ کے ساتھ بدعہدی تو نہیں مگر ہاں ایک قسم کی زیادتی ضرور کی تھی۔ نسوانی فطرت بھی عجیب ہے اور مجھے دیکھئے کہ مجھے یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ انکو اس امر کا افسوس ہو کہ خود انھوں نے "ایک طرح کی زیادتی" اس کے ساتھ کی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ میں خود اسپر تاسّف کرلوں کہ لاعلمی میں مشیتِ ایزدی سے میں نے اوسکو ایک اچھے شوہر سے بے جانے بوجھے اور محض اتفاقاً محروم کر دیا۔ حالانکہ اگر دیکھا

جائے توان کا افسوس کرنا حق بجانب تھا اور میرا افسوس کرنا بیکار رہتا۔ انکی تھوڑی بہت خطا تھی بھی کہ دیدہ و دانستہ اُنھوں نے ایسی اچھی لڑکی کو خواہ مخواہ میرے لئے ٹھکرا دیا مگر میری تو ذرہ بھر خطا نہ تھی۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو انکی بھی کوئی خطا نہ تھی کیونکہ اُن پر میری زندگی خراب و تباہ کرنے کا ایسا الزام آتا تھا جس کی ذمہ داری سولہ آنہ اُنہی پر عائد ہوتی تھی۔ پھر بھی مجھے یہ منظور نہ تھا کہ مولانا ذرہ بھر بھی افسوس کریں۔

میری شادی کا تاریک ترین پہلو اگر تھا تو بس یہی تھا۔ میں نے پھر مولانا کے متین چہرہ کو غور سے دیکھا۔ مجھے زیادہ تکلیف ہوئی۔ مجھے بُرا معلوم ہوا اور میں نے افسردگی سے کہا۔

"تم خواہ مخواہ کیوں اس قسم کی باتیں کرتے ہو؟"

واہ رے ناصح کہ اسکا جواب بھی انھوں نے عجیب دیا ہے۔

"ہیں!" میرے مُنہ سے نکلا مگر وہ میرے ہاتھ سے تصویر جھپٹ کر چاک بھی کر چکے تھے، کیا میں اُن کی اِس حرکت سے خوش ہوئی؟ . . . افسوس کہ مجھے اقبال ہے کہ میں خوش ہوئی۔ اب میں جو غور کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کے علاوہ دُنیا میں کوئی جواب نہ تھا جو مجھے مطمئن کر سکتا۔

خط پھاڑ کر مولانا بولے کہ۔ "اور تو کچھ نہیں مجھے صرف اتنا خیال آتا ہے کہ وہ آگرہ سے آکر مجھے سے مجھے دیکھ گئی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔"

پہلے بھی کہہ چکے تھے اور مجھے یہ بات معلوم ہی تھی۔ فیروزہ مجھے تیس خط لکھ چکی تھی اور میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تھا۔ اسکو یہ تک نہ معلوم تھا کہ میری شادی کے مہینہ بھر بعد ہی بلکہ اس سے شاید کچھ پہلے جو اُسکا خط میرے پاس آیا تھا، وہ میرے لئے ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اُس نے مجھے لکھا تھا کہ "بہن میری بھی تمہاری سی قسمت ہو گئی" پھر ایک دم سے

اپنے منگیتر کی شادی ہو جانے کا از راہِ تعجب لکھا تھا کہ "یا تو سنا تھا اب تاریخ مقرر ہو گی اور یا پھر ایک دم سے سنا کہ معلوم کہاں کسی لڑکی کو ریل میں دیکھکر اُس سے شادی بھی کر لی"! یہ خط میرے گھر کے پتہ پر گیا اور پھر وہاں سے یہاں آیا۔

میں بھلا اس کا کیا جواب دیتی! بلکہ یہ کہئے کہ کیسے دیتی۔ ایک دو ہیں بلکہ بلا مبالغہ درجنوں خط لکھنے کے کاغذ جراب کئے روز کا دستور ہی یہی ہو گیا کہ اوس کا دوسرا خط آیا پہلے خط کے کوئی پندرہ بیس روز بعد۔

اس خط میں پہلے خط کے جواب نہ ملنے کی شکایت تھی اور پھر اپنا حالِ دل تھا۔ درصل وہاں کچھ کچھ شاہدہ کا سا مضمون پیش ہو گیا تھا واقعہ درصل یوں ہوا کہ دو جگہ سے اُسکی شادی کا پیغام گیا۔ ایک تو مولانا کا اور ایک اور دوسری جگہ سے دونوں جگہیں اچھی تھیں بلکہ دوسری جگہ ہمارے یہاں سے بھی مالی حالت میں اچھی تھی۔ فیروزہ کی شہر میں اصلی معنی میں روشن خیال اور یہ نہ سمجھیں کہ کہیں بعد میں یہی روشنی "بلا" نہو جائے آزاد تو تھیں ہی شوق چرایا کہ لاؤ منگیتر کو دیکھوں، چنانچہ دوڑیں بی دیکھنے آگرہ تو تھا ہی۔ کسی ملنے والی کے ذریعہ سے تاک جھانک کرکے اپنا اطمینان کرکے چلی گئیں اس کے بعد اب ایک نئی صورتِ حال پیش ہوئی وہ یہ کہ ایک کو تو دیکھ کے پسند کر لیا مگر دوسرا دیکھنے ہی میں نہ آیا لہذا اُنہوں نے یہ طے کر لیا کہ بغیر دیکھے ہی اُسے ناپسند کر دیا جائے۔ چنانچہ اِن سے جب گھر والوں نے کسی ترکیب سے عندیہ لیا تو انہوں نے مولانا کے حق میں فیصلہ دیا اور دوسرے صاحب کو ناپسند کر دیا۔

دوسرے منگیتر یا امیدوار کا نام یوسف تھا اور قسمت تو دیکھئے کہ انکی بھی ایک خاتون کی طرح بہن تھیں۔ چنانچہ وہ ہاتھ دھو کر فیروزہ کے پیچھے پڑ گئیں۔ مگر وہ غلطی پر تھیں کیونکہ فیروزہ کے یہاں ضرورت سے زیادہ آزادی تھی اور ایسے معاملات کی وہ اس درجہ تک مختار تھی کہ والدین

اس کی خلاف مرضی کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔

مگر کوشش کرنے والے یہ باتیں تھوڑی دیکھا کرتے ہیں چنانچہ بہن اور بھائی دونوں نے کوشش کرنا شروع کی وہ اس طرح کہ فیروزہ کے عزیزوں، رشتہ داروں کے ذریعہ سے سفارشیں بہم پہونچائیں۔ ہر ملنے والے اور ملنے والی کو درمیان میں ڈالا اور انتھک کوششیں کیں۔ ظاہر ہے کہ حرکتیں ایک لڑکی کو کہاں تک پسند ہو سکتی ہیں جو بقول فیروزہ "لڑکیوں کے سر یہ ایک نیا فرض تھوپ دیا گیا ہے اور نئی ڈیوٹی لگا دی گئی ہے۔ کہ ہر دم وہ مسلسل کوششیں اس بات کی کرتی رہیں کہ انکی شادی اس لڑکے کے ساتھ نہ طے ہو کر پختہ ہو جائے جس کے ساتھ وہ شادی کرنے پر رضامند نہیں" چنانچہ پھر اس سلسلہ میں فیروزہ نے سخت سخت خط یوسف صاحب کی بہن کو لکھے۔ حد کر دی کہ ان کو اور ان کے بھائی کو کمینہ تک لکھ مارا جب اس حد تک طرفین میں منافرت بڑھ گئی تب جا کر فیروزہ کی جان چھوٹی اور یکسوئی حاصل ہوئی اور جب اُس طرف سے کوئی خدشہ نہ رہا اور شادی مولانا کے ساتھ پختہ ہونے کو ہوئی تو یہ شگوفہ کھلا۔ یعنی میری شادی ہو گئی۔ جب تک فیروزہ پر کچھ نہ گذری تھی اوس وقت تک یہ تمام باتیں اس نے مجھے نہیں لکھیں مگر جب اوس کی ہی شادی چھوٹ گئی تو اوس نے اپنے دوسرے خط میں سارا کچا چٹھا مجھے لکھا اور یہ بھی لکھا کہ اب وہ پھر کوشش میں ہیں۔ مگر میں نے اس خط کا بھی کوئی جواب نہ دیا بلکہ یہ کہو کہ دنیا تو بہت چاہا دے نہ سکی گھنٹوں سوچتی۔ رنجیدہ سی ہو جاتی۔ کاغذ پہ کاغذ لکھنے کی کوشش میں لگاڑتی مگر خط نہ لکھ سکتی۔ مجبور ہو جاتی اور پھر رفتہ رفتہ دھیان سے بات اتر جاتی۔

اس کے بعد اسکا تیسرا خط آیا اور یہ رجسٹری شدہ تھا لہذا لینا پڑا۔ اس میں میرے جواب نہ دینے پر غصہ کا اظہار اور ابھی نہ تھا بلکہ اظہارِ پریشانی اور ہمدردی کیا تھا۔ کیونکہ وہ بیچاری تو یہی جانتی تھی کہ میں اور اماں جان دونوں میری شادی ہونے کی وجہ سے پریشان ہیں اس غریب کو کیا

معلوم کہ میں نامعلوم کب کی اس کے انتخاب کی داد بھی دے چکی ہوں۔ اس خط میں اُس نے لکھا تھا کہ "شکر ہے یوسف صاحب سے جان چھوٹی"! بڑی تفصیل سے اُس نے یوسف صاحب کی "کمینہ حرکتوں" کا ذکر کیا تھا کہ "اب جبکہ دوسری جگہ کوئی واسطہ نہ رہا تھا ممکن تھا کہ میں اتنی مخالفت نہ کرتی مگر یہ کمینہ حرکتیں ایسی ہیں کہ مرتے مر جاؤں یہ بات (یعنی شادی) ہرگز نہیں ہو سکتی"

اس خط کا جواب میں نے دیا تھا۔ اس میں بے کم و کاست سچا سچا واقعہ الف سے لیکر ی تک لکھدیا تھا۔ اور یہ بھی لکھدیا تھا کہ تمہارے بیشتر کے دونوں خطوں کا کس کس طرح جواب لکھنے کی کوشش کی۔

اب لطف دیکھئے کہ میرے اس خط کا جواب ندارد میں بھی چپ ہوگئی۔ آخر کو ایک خط آیا اور اوس میں میری اس عجیب و غریب شادی پر مبارکباد بھی تھی۔ اظہار خوشی بھی تھا اور طرح طرح کے خیالات سے خط پڑھتا اور ٹیپ کا مصرعہ بھی تھا یعنی یہ کہ دوسری جگہ شادی طے ہو رہی ہے بلکہ "پختہ ہی سمجھو"! اس جگہ ہی تفصیل تھی۔ یہاں ہونے والے شوہر کی بھی مختصر سوانحعمری معہ روئداد تھی اور لطف یہ کہ ساتھ ہی پھر یوسف صاحب پر تبرا بھی تھا جیسے "کمینہ پن اور خودغرضی کی مثال دنیا میں ملنا مشکل ہے"!

اس خط کو پڑھ کر میں بہت خوش ہوئی کیونکہ شادلہ مبارکباد اسی وجہ سے ممکن ہوا۔

ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ پیرورہ اتنے قریب تھی اور نہ میری ہمت پڑتی تھی کہ اُسے ملاؤں کہ بس صبح آنا شام کو چلی جانا اور نہ انکو خیال کہ لکھیں کہ بہن بہت دن ہو گئے ملاقات کئے ایک دو روز کے لئے آؤ گی۔

جب اس طرح میرے سر سے ایک بار سا اُتر گیا تو ہم دونوں سہیلیوں میں خط و کتابت کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ زیادہ تر خطوط میں وہی تذکرہ ہوتا تھا۔ یعنی شادی کا میں لکھتی تھی تو بھی۔ اور یہی درصل دلچسپ ترین عنوان بھی تھا۔

(۲)

اس کے عرصہ بعد کا قصہ ہے کہ مولانا سے ملنے باہر دو تین لڑکے آئے مولانا تیزی سے میرے پاس دوڑے آئے اور اُنھوں نے مجھے چپکے سے بتایا کہ "وہ دیکھو ٹینس کا بلّا لئے داہنا پیر کرسی پر رکھے کھڑے ہیں۔ یہ ہیں وہ یوسف"

مولانا یہ کہکر جھپٹ کر سگرٹوں کا ڈبہ لیکر پہونچے اور شاید اس خیال سے کہ میں اچھی طرح دیکھ لوں سامنے کے درخت کے پاس سے ساتھیوں کو لئے نکلے چلے گئے۔

میں نے مسٹر یوسف کو غور سے اور اچھی طرح دیکھا خوب گورے چٹے خوبصورت آدمی تھے۔ بالکل صاف اور روشن چہرہ تھا گھنے بال تھے۔ اور اچھا بڑا قد تھا۔ تندرست اور طاقتور معلوم ہونے تھے غرض نہایت ہی کشیدہ قامت اور خوش رو جوان تھے جہانتک لباس اور دوسری اُوپری چیزوں کا تعلق تھا ضرورت سے زیادہ روپیہ پیسہ والے اور اچھے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان میں کون سی وہ خوبی نہیں ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی انکو ناپسند کر سکے مگر پھر میں نے سوچا کہ ظاہر بندے کو معلوم ہے اندر کا حال جانے خدا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا اچھا نوجوان بھلا کس طرح کمینہ پن پر اُتر آئے گا۔ حالانکہ خود ابوالحسن صاحب کا واقعہ میرے سامنے تھا مگر بجد اان میں اور ابوالحسن صاحب میں وہ فرق تھا جو زمین اور آسمان میں ممکن ہے۔

شام کو مولانا سے اور تفصیلی حالات پوچھے۔ مولانا بھی اُن سے ملکر کچھ حالات بتا اور سنا اور پوچھ اور سُن چکے تھے، حالانکہ پہلی ہی ملاقات تھی یعنی تعارف آج ہی ہوا تھا ذرا لطف تو دیکھئے کہ یہ حضرت بھی گویا کہنے میں "پہلے چکے" تھے مگر محض اپنی بہن کے ورغلانے پر فیروزہ پر کچھ عاشق سے ہو چکے تھے۔ مگر چونکہ خود انھوں نے فیروزہ کو نہیں دیکھا تھا دیہ بھی اتفاق ہی کہئے اور یا ان حضرت

کی سُستی، ورنہ وہ تو بُرقعہ کا نقاب سر پر ڈالے دندناتی پھرتی تھی۔ بس اپنے ماناکی خاطر قسم کھانے کو بُرقعہ ضرور پہنے رہتی تھی) لہٰذا نہ تو اُنہیں فیروزہ کے نہ ملنے کا افسوس تہا اور نہ خیال ہی تہا یہ ضرور کہتے تھے کہ "میری بہن مارے تعریف کے مری جاتی تھی اور اُس نے ضرور بیحد کوشش کی اور تہوڑی بہت میں نے بھی کی"

کچھ اُس کمینہ پن کی اور بہی تفصیل معلوم ہوئی جسکا ذکر فیروزہ نے اپنے خطوں میں بار بار کیا تہا۔ یوسف صاحب کو تسلیم تہا کہ اُنہوں نے تو کم مگر ہاں اونکی بہن نے البتہ یہ کیا کہ معلوم بہی ہوگیا کہ فیروزہ کی مرضی نہیں ہے، پھر بھی ایک خاص ذریعہ سے فیروزہ کے چچا اور ماموں صاحب سے لیا زور ڈلوایا تہا کہ کامیابی ہو ہی گئی تہی۔ مگر یوسف صاحب نے دل کی بات کہدی کہ "سچ پوچھتے ہو تو جب مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ خود فریق ثانی کی مرضی نہیں ہے تو میری دلچسپی ہی جاتی رہی تہی اور اسکو کبھی بھولکر بھی خیال نہیں آتا"

کچھ بھی ہو یہ باتیں تو محض اب بیکار تہیں، کیونکہ اُدہر فیروزہ کی شادی طے ہو رہی تھی بلکہ ہو چکی تھی اور ادہر یہ حضرت ولایت جانیکے لئے پر تول رہے تھے۔

میں نے فیروزہ کو لکھنا مناسب نہ سمجھا اور تذکرہ تک نہ کیا کہ میں نے یوسف صاحب کو دیکھا اور انکو کم از کم اسم بامسمیٰ تو ضرور پایا

اس قصہ کو سنانے کی مجھے اسوجہ سے اور بھی زیادہ ضرورت پڑی کہ اور سہیلیوں کے حالات تو میں نے بتائے اگر اپنی سب سے پہلی منہ بولی بہن کے حالات محض اِسوجہ سے چُھپاتی کہ جہاں اُس کی شادی ہو رہی تھی میری ہوگئی۔ تو یہ سراسر زیادتی ہوتی۔



الٹی میٹم[11]

خاتون کا الٹی میٹم! شاہدہ نے اُسے ہنس کے اُڑا دیا۔ اسکو یقین امید تھی کہ اسکی مرضی کے خلاف کسی کی نہ چلے گی ایسی باتیں اماہاد پڑھے لکھے تعلیم یافتہ گھرانوں میں ہو یا ہی ناممکن ہو اور بالخصوص نئی تہذیب اور نئی روشنی کے دور میں۔ جب چھوٹے بڑے سب کی زبان پر یہی ہو کہ لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی نہ ہو۔ اور بغیر لڑکی کے مشورہ کے گفت و شنید پختہ نہ ہو تو ڈر ہی کا ہیکا بلکہ شاہدہ نے کہا کہ "دیکھنا اس کی عقل ٹھکانے نہ کر دی ہو تو میرا ذمہ"

"اے میں نے سُنا ہے بہن خاتون تمہارے میاں نے کسی کوئلہ کی کان کا ٹھیکہ لیا ہے"۔ بی شاہدہ نے ایک جگہ ہم عمروں کے جھمگٹ میں خاتون اور اُن کے گھرانے کی سانولی رنگتوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

مگر خاتون تو شاہدہ کی عاشقِ زار تھیں سخت سے سخت جُملے اور فقرے سے بُرا نہ مانیں۔ جواب میں بولیں "کوئلہ میں تو گھاٹا بیٹھا اب یہ تجارت ہی چھوڑ دیں گے"!

ایک قہقہہ لگا اور بی شاہدہ چمک کے بولیں "تو پھر کیا کریں گے؟"

"کریں گے۔" خاتون اپنے بلیچ چہرہ پر شرارت کا نور اکٹھا کر کے بولیں۔ "اب خیر سے کچھ کہریا کے تاجروں سے بات چیت ہو رہی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"
شاہدہ پر یہ کٹتا ہوا جملہ چھا گیا۔ ایک قہقہہ لگا۔ شاہدہ کا میگزین ظرافت ختم ہو چکا تھا۔ لہذا آگئیں وہ پتھروں پر۔ تیر کی طرح انہوں نے یہ چوٹ کہائی اور بلبلا کر اور جلکر بولیں۔
"یہ منہ اور مسور کی دال اے بہن تمہارے پاس تو روپیہ ہے۔ پھر بیس ہزار ہیں تو چار حبشنیں آئیں گی گوشتِ خر دندانِ سگ بمضمون خوب رہیگا۔"
یہ سخت حملہ خاتون نے بالکل نئے طریقہ پر لیا۔ بولیں۔ "ہم کیوں حبشنوں کو لائیں۔ ہم تو ایک ترکن لائیں گے۔" یہ کہکر شاہدہ کی طرف مسکرا کر خاتون نے آنکھیں جھپکائیں۔
"کبھی دیکھی ہے ترکن تم نے؟" شاہدہ سر ہلا کر بولی۔ "کبھی خواب میں بھی دیکھی ہے؟ موئی حبشن کوئی دیکھی ہوگی اپنی سری کی . . ."
"ہاں دیکھی ہے۔ حبشن نہیں ترکن۔ بلکہ ترکن کیا چیز ہے اصلی کوہ قاف کی پری دیکھی ہے . ارے بھائی جان! . . . اے . . . . . . یہ دیکھو۔ کوہ قاف کی پری ہے۔ . . . . ."
یہ کہکر بی خاتون نے لیک کے میز پر سے آئینہ اٹھا کر شاہدہ کے منہ کے سامنے کر دیا کہ "یہ دیکھو!"
بس بیان سے باہر ہے جو لطف آیا۔ ایک قہقہہ لگا اور شاہدہ نے ہی کھسیانی ہنسی ہنسکر آئینہ پر ایسا ہاتھ مارا کہ خاتون بی کے منہ پر لگا لیکن شاہدہ اب ضرورت سے زیادہ تختۂ مشق بن گئیں۔ مارے غصہ کے ناشائستہ کلمات منہ سے نکل گئے "چڑیل کمبخت۔ تیری بھابی جان ہوگی کوئی گنواری . . ."
"کوہ قاف کی پری!" چمک کر خاتون نے کہا اور جلکر شاہدہ نے خاتون کے گھر کے گھر کو اس

بُری طرح لے ڈالا کہ ہم لوگوں نے۔ بیچ بچاؤ کیا۔ شاہدہ کے تمام سخت و سُست جملے خاتون نے سُنے مگر چہرہ پر شکن نہ ڈالی۔ بڑی مشکل سے خاتون کو روکا کہ وہ آیندہ بھائی جان نہ کہیں، وہ راضی ہو گئیں اور ہم لوگوں نے چاہا کہ شاہدہ سے انکی صلح کرا دیں۔

خاتون نے شاہدہ کے گلے میں باہیں ڈالیں۔ ہاتھ جوڑے۔ خوشامد کی مگر شاہدہ نہ ماننا تھا نہ مانی بلکہ پھر سخت و سُست جملوں پر آ گئی۔ "دیکھنا ہے"! آخر کو جلکر جُھکے سے خاتون نے کہا۔

"دیکھنا ہے آخر تو بی جاتی کہاں ہیں۔ نہ بھائی جان بنا کر چھوڑوں تو خاتون نام نہیں"

شاہدہ نے جب یہ جملہ سُنا تو کہا "چڑیل کہیں کی آئی ہے وہاں سے غلاموں کا پیغام لیکر، خدا غلام بنائے مگر غلاموں کی سی صورت نہ دے"!

قصہ مختصر نہایت ہی بدمزگی سے خاتون سے لڑائی ٹھن گئی۔

(۲)

مگر خاتون کا پلّا بھاری پڑ رہا تھا۔ صورت شکل تو خدا کی دی ہوئی ہے مسٹر ابوالحسن ویسے نہایت ہی تیز اور ہوشیار طالب علم تھے اور پھر تعلیم کی بھی آخری سال تھی۔ علاوہ اسکے رئیس کے لڑکے اور خود کفایت شعار نوجوان ایسے کہ اس طرح رہتے تھے کہ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ رئیس باپ کے بیٹے ہیں پھر ایسے لڑکے کا پیغام کسی کے یہاں جائے بیس ہزار نقد مہر کے ساتھ اور کوٹھی منہ دکھائی کو تو بھلا کون ہوگا جو انکار کر دے۔ مرد کی قابلیتیں دیکھی جاتی ہیں صورت نہیں دیکھی جاتی اور پھر یہاں تو دولہا میں قابلیت اور دولت اور تعلیم یہ تینوں اصول خوبیاں موجود تھیں۔ شاہدہ کے ماں باپ بھی نہایت روشن خیال لوگ تھے اور بھلا فرض انھوں نے یہ سمجھا کہ لڑکی کا عندیہ لیں۔ لڑکی کی اُلٹے روز روشن تھی لہذا اب ہم لوگوں کو ایک روز بُلا کر شاہدہ کی والدہ صاحبہ نے کانفرنس منعقد کر کے کہا کہ شاہدہ کو سمجھائیں۔ ہم سب نے وعدہ تو کر لیا مگر ایمان کی بات

ہے کہ بجائے سمجھانے کے مسٹر ابوالحسن کی باتیں سن سُنکر اور الٹا بھڑکا یا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ کہیں دوسری جگہ تجویز ہو مگر بس نہ چلتا تھا غرض یہی کشمکش تھی اور محض اسی وجہ سے شاہدہ کے والد صاحب نے باوجود سخت تقاضوں کے ابوالحسن صاحب کے پیغام کا جواب نہ دیا تھا بلکہ کہہ دیا تھا کہ ہم سوچ رہے ہیں اسی دوران میں جب ہر طرح خاتون کا پلّا بھاری پڑتا معلوم ہوتا تھا اور شاہدہ بے طرح گھبرا رہی تھی کہ ایک عجیب ہی معاملہ پیش آیا۔

(۳)

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے کمرہ میں بیٹھی سی رہی تھی کہ تانگہ کمرہ کے سامنے آکر رُکا۔ شاہدہ بی جھٹ سے اتریں۔ میں تانگے والے کو دام دینے میں لگی اور شاہدہ بی کمرہ میں جاکر پلنگ پر لیٹ گئیں۔

"میں کیوں آئی ہوں؟" شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا

میں نے دیکھا کہ شاہدہ بے طرح مسکرا رہی ہے۔ کہاں تو خاتون کا الٹی میٹم جب سے آیا تھا متفکر رہتی تھی اور کہاں چہرہ پر یہ نور!

میں نے سر سے پیر تک شاہدہ کو دیکھا۔ بے حد شگفتہ پایا۔ "خیر تو ہے" میں نے کہا "کیا کوئی نئی خبر"

"ہاں۔ نئی خبر یہ کہ موذی مرگیا"

"کون!" میں نے کہا "کون مرگیا؟"

"وہی کمبخت ... علام .. خاتون والا!"

"ہیں!" میں نے متعجب ہو کر کہا "کہیں"

ہنسکر شاہدہ نے کہا "پرسوں" اور یہ کہکر میرے منہ پر ایک خط پھینک مارا

میں نے خط اٹھاکر کھولا اور پڑھا مارے خوشی کے میں اوچھل پڑی۔ یہ شاہدہ کے چھوٹے

ماموں کا خط تھا جو اُنھوں نے اپنی بہن کو لکھا تھا شاہدہ کی شادی کے بارہ میں اپنے سالے میاں شاہد کے ساتھ۔ وہی گلاب جامن والے۔ شاہد!

میرا یہ حال ہو گیا کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے، مارے خوشی کے شاہدہ سے لپٹ گئی، اوہ! میں کس قدر خوش تھی بیان نہیں کر سکتی میں نے خط کو پھر پڑھا اور پھر پڑھا۔ ماموں صاحب کی بی بی دولہن کی فرمائش تھی اُنھوں نے کس زور سے اپنی بہن کو لکھا تھا۔ "شاہدہ کو تمہیں دینا پڑیگا۔ میں کوئی عذر نہ سنوں گا۔" پھر لڑکے کی تعریف تھی، ہم دونوں سے زیادہ پہلا لڑکے کی تعریف کون جانتا تھا۔

شاہدہ نے کہا: "مجھے تو بس یہ خوشی ہے کہ اُس کا جل ٹوٹی کی اچھی طرح خبر لونگی۔ جینا دوبھر نہ کر دوں تو میرا نام۔"

معاملات پختہ تھا۔ کل خط لکھدیا جائیگا کہ ہمیں منظور ہے۔ یہ سب باتیں شاہدہ خوب اچھی طرح چپکے سے سنکر آئی تھی، خط اپنے والد کے کوٹ کی جیب میں سے اُڑا لائی تھی اور کہنے لگی کہ میں جاتی ہوں اس دوران میں کہیں آ نہ جائیں۔ میں نے اُس سے کہا "کمبخت اب کہلا ایک دعوت اچھی سی۔" چاچیہ اُس نے فوراً منظور کر لیا۔ کہنے لگی "تو اپنے یہاں چپکے سے کیجیو۔ بلکہ کل ہی کر دے میں دس روپیہ تک خرچ کر دوں گی مگر ہاں ذرا اسے کلموہی کو ضرور بلوائیو۔"

یہ کہکر شاہدہ چلی گئی روپیہ اسی روز شام کو اُسے بھیج دیئے مگر یہ تجویز کیا کہ باضابطہ جب ماموں کے خسر صاحب کے یہاں سے پیغام آ جائے اور ضابطہ کا جواب اِدھر سے چلا جائے جب دعوت ہو۔ کیونکہ ابھی تو محض ماموں کو خط لکھا جا رہا تھا کہ آپ پیغام بھجوائیے۔

(۴)

کوئی دس روز مشکل سے لگے ہوں گے کہ اُدھر سے پیغام آ گیا اور اِدھر سے اُسکو قبول کر کے

جواب بھی لکھدیا گیا اور اب شرائطِ شادی طے ہونا رہ گئیں جیسا کہ دستور ہے۔
چنانچہ اب زور کی میں نے ایک چاء پارٹی بولدی۔ روپیہ پانچ شاہدہ کی گردن دباکر اور لئے گئے۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی کہ یہ پارٹی شاہدہ کی طرف سے منگنی کی خوشی میں ہو رہی ہے کیونکہ میں نے دعوتی رقعے بہت سادگی سے بھیج دیئے تھے کہ آج شام کو میرے یہاں چائے کی دعوت ہے اور بس۔



میں نے اور رحم والی نے اور زینت نے غرض سب نے شاہدہ کو خوب مبارکبادی اپنے اپنے حصہ کے موافق خوب خوش ہو ہو کر مارا شاہدہ یہ کہنے لگی کہ خاتون بی کو تنگ کریں۔ میں نے صاف کہدیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں اور پھر میری وہ مہمان ہونگی۔ لطف یہ کہ اُنکو بیچاری کو پتہ تک نہ تھا کہ بالا بالا شاہدہ کی بات چیت دوسری جگہ پختہ بھی ہوگئی۔
جیسے ہی خاتون آرہی ہیں شاہدہ لپک کے پہونچی جھک کر مودبانہ سلام کیا۔ پھر بڑے پیار سے اُن کے گلے میں ہاتھ ڈالدیا اور بولی "ہٹو سامنے سے ہماری نند ہیں یا اللہ رکھے، رستہ میں نند ہیں گی۔ ہمیں بیاہ کے لیجائیں گی۔ بھائی جان سنا کے ہمیں"
کہاں تو اس لفظ سے شاہدہ کے آگ لگتی تھی اور کہاں یہ باتیں۔ خاتون ذرا چکرائی کہ یہ معاملہ کیا ہے ہم لوگوں کی صورت جو دیکھی تو سمجھ گئی کچھ دال میں کالا ہے کچھ جھینپ سی ہوگئی کہ الٰہی کیا ماجرا ہے شاہدہ نے لاکر بٹھایا اور پھر ایک ٹہوکا دیا کہ "بہن بولتی کیوں نہیں۔ کیا خفا ہوگئیں ہم سے؟" "میں کیوں خفا ہونے لگی تم سے!" مُسکرا کر خاتون بولیں۔
"ہاں بہن خفا نہ ہونا" شاہدہ نے کہا۔ "نندی تو خاقی ہے اے . . ."
"کہاں؟" مُسکرا کر خاتون نے کہا۔ "بہن کہاں خاقی ہو؟"

"گلاب جامنیں کھانے!" شاہدہ نے ہنسکر کہا "اور کہاں؟ . اے لو بہن تمہیں نہیں معلوم! گلاب جامنوں کا مجھے بڑا شوق ہے!" یہ کہکر سامنے مٹھائی کی ٹوکری سے کرید کر ایک گلاب جامن نکالکر اُنہیں دکھائی اور کھانے لگی۔

خاتون کا چہرہ ایک دم سے فق سا ہو گیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں کیونکہ شاہدہ کا گلاب جامن والا قصہ وہ سُن ہی چکی تھیں۔ اور اب شاہدہ کی خوش دِلی اور گلاب جامن کا نام سُنکر اُن کو معلوم ہو گیا کہ کیا معاملہ ہے۔

غرض طرح طرح سے شاہدہ اِن پر چھیٹے کستی رہی اور یہ کچھ گھرائی سی سُنا کیں۔ مجھ سے اُنہوں نے جب تصدیق کی تو میں نے واقعہ بتا دیا کہ سب معاملہ طے ہو چکا ہے۔ خط بھی گیا۔ بیچاری پر اوس سی پڑھ کر رہ گئی۔

اس جلسہ میں کوئی بات سوائے اِس کے قابلِ ذکر نہیں کہ طرح طرح سے شاہدہ نے خاتون کو تختۂ مشق بنایا اور کیوں نہ بناتی کہ بَن آئی تھی۔

چپکے سے مجھ سے اِجازت لیکر جانے کے بعد ہی خاتون بی ایسی رفو چکر ہوئی ہیں کہ شاہدہ ڈھونڈھتی ہی رہ گئیں! "اے وہ کہاں گئیں مجھے بھابی جان سا بوالی؟ ...... ارے میری سد سبنے والی کلوٹی ." وغیرہ وغیرہ نہ معلوم خوشی میں کیا کیا کہا۔ خوب خوب اترائی۔ "بہن کوئی گلاب جامن بغیر میرے پُوچھے مت کھانا!" غرض اسی قسم کی باتیں شاہدہ پھلجھڑی کی طرح کر رہی تھیں رات کو خوب خوب شاہدہ نے گانا سُنایا مگر کوئی مصرعہ ایسا نہ تھا جس میں بی خاتون کا طنز ذکر نہ گھسیٹا ہو۔

باب (۱۲)

"گُڑ کے لڈّو"

(۱)

مہینہ بہر مشکل ہی سے گذرا ہو گا جب ہم سب نے شاہدہ کی منگنی کی دعوت کہائی ہتی کہ ایک سرے سے عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے یہاں چاے کی دعوت کے بعد اسی دوران میں دو مرتبہ اور شاہدہ خاتون کی مٹی پلید کر چکی ہتی اور اب شاہدہ سے خاتون سے کشاکش ہو چکی ہتی شاہدہ کا جارحانہ رویہ خاتون کے لیئے ناقابلِ برداشت سے بہی زیادہ ہو چکا تہا اور اپنی ہم عمروں میں خاتون کا اُٹہنا بیٹھنا دوبہر ہو گیا تہا۔ غرض میرے یہاں کی دعوت کو مہینہ بہر مشکل سے ہوا ہو گا کہ ہم سب کا اسکول کے ایک ڈرامہ میں جانا ہوا۔ ہم میں سے کسی کو خیال بہی نہ تہا کہ ڈرامہ دیکہنے بی خاتون بہی ضرور ہی آئیں گی۔ ہم لوگوں کے پہونچتے ہی ایک دم بائیں جانب سے خاتون آئیں۔ ان کے چہرہ پر اس وقت ضرورت سے زیادہ نمک اور نکہار تہا اور مسکرا کر اُنہوں نے عجیب طنز سے کہا "سلام علیکم بہابی جان کو . . . "

اُن کی طرف دیکہا تو ایک عجیب معنی خیز مسکراہٹ اُن کے چہرہ پر رقص کر رہی ہتی! ایک دم سے شاہدہ جیسے دہک سے ہو گئی۔ مگر لمحہ بہر کے لیئے یہ بات ہتی کہ وہ چیخ اٹہی "اہا . . بی خاتون . . . ہماری کوئلہ جیسی نند نہیں گی" یہ کہکر مسکراتی اٹہلاتی شاہدہ بی خاتون کو مذاق پہ بہرلینے کو تہی

خاتون نے مسکرا کر نہایت ہی سگفتگی سے کہا۔"کیوں نہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے" کوئلہ جیسی نند کو چاند جیسی بھاوج خدا نے دی... بھابی جان۔ ذرا اِدھر دیکھو.. گُلاب جامنوں بھرا ڈونہ وہ تمہارا کیا ہوا؟ وہ گُلاب جامنیں کھانے کا شوق کدھر گیا؟" کس طرح چہک کر بی خاتون نے کہا ہے کہ بیاں سے باہر۔

"کدھر گیا!" شاہدہ نے عجیب لہجہ میں کہا۔"کچھ ہوش میں ہو۔ کاہے سے روٹی کھائی تھی آج؟"

"کچھ بست کی بھی خبر ہے؟" خاتون نے کچھ فاتحانہ انداز سے کہا۔" ... بھابی جان۔ کچھ بست کی بھی خبر ہے۔ کچھ خبر بھی ہے؟۔ کوئی تار؟.... کہیئے؟ کچھ خبر ہے؟۔ .... گُلاب جامنوں کا پارسل سات سمندر پارا.... اتو کالے کالے گُڑ کے لڈو ہیں کھاؤ تو نہ کھاؤ تو... . "

ایک دم سے شاہدہ کا چہرہ فق سا ہوگیا اور ایک مسرت کی لہر خاتون کے چہرہ پر دوڑ گئی مگر خوش قسمتی سے چار چھ بی بیاں آگئیں اور اُن سے باتیں ہونے لگیں۔ شاہدہ بے حد پریشان سی تھی۔"یہ تار کیسا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ معلوم ہوا تار تو کل ایک آیا تھا یہ نہیں معلوم کہ کیسا تار تھا۔ مگر تھا ضرور ماموں صاحب کی سُسرال سے سمندر پار سے یہ مطلب شروع کے خطوں ہی میں وہاں سے لکھکر آیا تھا کہ لڑکے کو ولایت بھیجنے کا ارادہ ہے۔ اب خاتون کے نامکمل فقروں کا مطلب صاف تھا یعنی شاید تار اِس مضمون کا آیا ہے کہ لڑکا ولایت جا رہا ہے لہذا خاتون کو امید ہوگئی۔ شاہدہ نے اور میں نے غور کر کے دل کو تو سمجھا لیا کہ کہتی ہے" محض ذرا سی بات پر اُمید کا پُل باندھتی ہے مگر اِں طفل تسلّیوں سے کام چلنا دشوار تھا۔ میں نے خاتون کو علیحدہ لیجا کر دریافت کیا اور اُس نے یہ خبر جانکاہ سُنائی کہ چار سال کیلئے

میاں شاہد گلاب جامن والے گورنمنٹ کے وظیفہ پر ولایت گئے۔ شاہدہ کے والد نے اتنے دن انتظار کرنے سے انکار کر دیا اور آج ہی شام کو ہمارے یہاں آکر صرف بات ہی پختہ نہیں کر لی بلکہ تاریخ منگنی اور نکاح بھی مقرر ہو گئی۔ خاتون بے حد خوش تھیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ "ہماری بھابی جان سے صلح کرا دو۔ ڈیڑھ دو مہینہ کا تو معاملہ ہی ہے، اب گلاب جامنوں کو بھن بھول جاؤ۔ اب تو گڑ کے لڈو ہیں۔ ہنستے ہوئے خاتون نے کہا۔

کہاں کا ڈرامہ اور کہاں کا کھیل۔ شاہدہ واپس گھر بھاگی اور میں بھی اس کے ساتھ۔ شاہدہ کی والدہ صاحبہ سے میں نے دریافت کیا تو خاتون کا کہنا حرف بحرف صحیح پایا۔ منگنی کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ شادی کی تاریخ ہی طے ہو گئی اور ڈیڑھ مہینہ بعد ہی شاہدہ کی رخصت انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہدہ نے دانت پیس کر چپکے سے کہا: "کچھ پروا نہیں میں صاف انکار کر دوں گی۔" میں جلدی واپس گھر چلی آئی۔

(۲)

مولانا کا انتظار میں کر ہی رہی تھی کہ آ گئے پہلا سوال جو میں نے کیا وہ یہ تھا "آپ کی ابوالحسن صاحب سے ملاقات ہے؟"

"جو ہے میں ڈالو ابوالحسن کو" مولانا نے کہا: "میں نام تو اکثر سنکر البتہ تنگ آ گیا ہوں مگر مجھے نہیں معلوم وہ کون ہیں۔ حلیہ اور باتیں سنکر ایک صاحب پر میں نے شبہ کیا تو وہ ننگالی نکلے۔" کپڑے پھینک کے مولانا کھانے پر آئے تو اکڑ گئے: "میں اکیلے کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

در اصل اکیلے کھانا کبھی نہ کھاتے تھے اور سخت چڑتی میں نے ہنسکر کہا "تم کھاؤ تو میری اس میں خطا نہیں ہے۔ بس شاہدہ کے ہاں کھا آئی"

"شاہدہ کے یہاں! . . . مگر ہاں تم تو ڈرامہ دیکھنے گئی تھیں۔"

اسپر میں نے کُل کا کُل قصّہ سُنایا۔ مولانا بھی مشاہدہ کے بڑے طرفداروں میں تھے۔ کہنے لگے کہ "ضرور ابوالحسن سے ملوں گا اور انتہائی کوشش کروں گا کہ وہ خود نہ کریں" میں نے کہا کہ "انکو یہاں کل بُلا لاؤ۔ میں بھی دیکھ لوں کیسے آدمی ہیں" چنانچہ یہ طے ہوگیا کہ کل ضرور لائیں گے

(۳)

دوسرے روز مولانا کالج جاتے ہی فوراً آ گئے۔ "ابوالحسن صاحب ابھی آتے ہونگے" مولانا نے کہا۔

"کیوں؟ کیسے ڈھونڈا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

مولانا بولے "اجی وہ تو نہایت ہی کم رو اور پھر ضرورت سے زیادہ غیر وحیہ آدمی ہیں۔ لیکن ویسے ذہین اور تیز معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے انکا کلاس میں پتہ لگا کر اُن سے کہا "جناب کا نام ابوالحسن ہے؟"

وہ بولے۔ "ارشاد۔ فرمائیے"

میں نے کہا۔ "کیا آپ مجھے دس پندرہ منٹ دے سکتے ہیں؟ مجھے آپ سے کچھ ضروری کام ہے" اتنا کہنے پر اُنھوں نے میری طرف دیکھا اور مصافحہ کرکے میرا نام لیکر بولے "اجی حضرت مجھے تو خود آپ سے ملنا تھا قصہ مختصر میں اور وہ دونوں سمجھ گئے کہ کیوں ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے مولانا سے کہا "تم اُنکو ساتھ نہ لے آئے"

مولانا نے کہا "اُن سے طے ہوگیا کہ آج کی کلاس گول کیا جائے۔ وہ اپنی اور میری دونوں کی حاضری سوا کر آتے ہی ہونگے"

مولانا اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ وہ آ پہونچے۔ جلدی سے میں نے کمرہ کا پردہ کھینچ دیا کیونکہ

ہمارا کمرہ کافی بڑا ہے لہذا بیچ میں بڑا پردہ لٹکا کر اسکو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ایک حصّہ سونے کا کمرہ بن جاتا ہے اور دوسرا حصہ ڈرائنگ روم کا کام دیتا ہے۔ میں پردہ کے پیچھے گم سُم ہو کر بیٹھ گئی اور مولانا نے ابوالحسن صاحب کو ڈھکر لیا اور لاکر کمرہ میں بٹھایا۔ میں پردہ کے ایک سوراخ میں سے کونہ سے جھانک رہی تھی کہ ابوالحسن صاحب کو پتہ بھی نہ چل سکے۔ وہ بالکل میرے سامنے تھے اور اُنکی صورت دیکھتے ہی میں نے لاحول پڑھی۔ مولانا نے سگرٹ پیش کیا اور اُنہوں نے اِنکار کر دیا۔ پان سے بھی اِنکار کر دیا شاید تیسرے روز ڈاڑھی صاف کرتے ہونگے جگہ جگہ سے شکنیں پڑی ہوئی طوفاں زدہ شیروانی تھی اور اسی طرح کی اُجڑی سی ایک ترکی ٹوپی تھی۔ یہ سج دھج دیکھکر میرا دل میٹھ گیا۔

مولانا نے اُن سے گفتگو معاملہ کی شروع کی۔

"غالباً آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا"

اُبوالحسن صاحب مسکرا کر بولے "میں نہیں کہہ سکتا کس لئے مگر میرا خیال ہے کہ شاید اسلئے کہ آپ مجھ سے کہیں کہ اس شادی کے خیال کو چھوڑ دوں نہیں کہہ سکتا کہاں تک میرا قیاس صحیح ہے"

مولانا نے کہا۔ "اچھا یہ تو آپ کو معلوم ہے۔ آپ کا قیاس دُرست ہے مگر۔ ۔ ۔ ۔ "
بات کاٹ کر ابوالحسن صاحب بولے "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے سخت ناپسند کیا جاتا ہے"۔

"تو پھر ایسی صورت میں تو آپ خود غالباً میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ۔ "

بات کاٹ کر ابوالحسن نے اس طرح جملہ پورا کیا "مجھے آپکی رائے سے اتفاق ہے کہ مجھے انتہائی کوشش کرنا چاہئے اور بات بھی ٹھیک ہے۔ جب ہی تو آپ کی اور آپکی بیگم صاحبہ کی مجھے سفارش کی ضرورت ہے"

مولانا کچھ جھلا کر بولے "حضرت آپ نہایت ہی بذلہ سنجی سے کام لے رہے ہیں۔ مگر میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ لڑکی خود آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو آپ کو خود ہی یہ رشتہ نامنظور کر دینا چاہئے کیونکہ ناپسندیدگی کی شادی سے بدتر دنیا میں کوئی چیز نہیں، گھر دوزخ ہو جاتا ہے اور زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔"

"مجھکو یہ باتیں آپ سے بہتر معلوم نہیں" وہ بولے "اور میں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کر لیا ہے۔"

کچھ تیز ہو کر مولانا نے کہا۔ "اور پھر بھی آپ باز نہیں آتے!"

"اجی حضرت!" ابوالحسن صاحب بولے "یہاں باز آنے اور نہ آنے کا سوال ہی نہیں۔ یہاں تو یہ سوال ہے کہ اس معاملہ میں آپ اور آپ کی بیگم صاحبہ میری کیا امداد کر سکتی ہیں۔"

مولانا نے کہا "افسوس کہ میں یا میری بیوی اس معاملہ میں آپ کو ذرہ بھر مدد نہیں دے سکتے بلکہ ہم تو لڑکی کی مدد کریں گے کیونکہ وہ خود آپ کو منظور نہیں کرتی۔"

"لاحول ولا قوۃ" ابوالحسن صاحب نے کہا "آپ غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ سے میں اس معاملہ میں صرف اس طرح امداد کا طالب ہوں کہ آپ کوشش کر کے اُن کے دل میں جو میری طرف سے بدگمانیاں اور خراب خیالات معلوم کس طرح پیدا ہو گئے ہیں دور کر دیجئے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میری شادی باوجود اُنکی تمام مخالفت کے ہو جانے میں آپ امداد دیجئے بلکہ یہ کہ وہ مخالفت کرنا ہی خود چھوڑ دیں اور از خود اس رشتہ کو پسند کریں۔ میں خود ناپسندیدگی کی شادی نہیں چاہتا۔"

طنزاً مولانا نے جلکر کہا۔ "گویا یہ کہ وہ آپ کو پسند کرنے لگے۔"

ہنسکر ابوالحسن صاحب بولے "جی ہاں اور کیا۔ صورت شکل خدا کی دی ہے۔ اِسکو چھوڑ کر مجھ

میں جو خرابی نظر آئے آپ یا آپ کی بیگم صاحبہ اور یا خود وہ مجھکو بتائیں کہ تجھ میں یہ خرابی ہے اور جب تک یہ دُور نہ ہو جائے گی تو قابلِ نفرت ہے۔ پھر اگر اُس کے دُور کرنے میں میری طرف سے کچھ کوتاہی ہو یا میں ناکام رہوں تب آپ شوق سے اس شادی کی مخالفت کریں۔ ورنہ دوسری صورت میں میری سفارش کریں اور میرے حق میں کوشش کریں' ویسے بات تو طے ہو ہی چکی ہے مگر ماشاءاللہ وہ خود ہوشیار ہیں اور در اصل کچھ بات پختہ نہیں کیونکہ آخر میں جاکر "ہاں یا ناں" تو اُنہی کے ہاتھ میں ہے۔"

بات تو در اصل ابو الحسن صاحب نے بڑے پتے کی کہی تھی مگر مولانا نے بھی خوب جواب دیا کہنے لگے "آپ کا کہنا بہت ٹھیک ہے مگر کیا معلوم کہ لڑکی آپکو محض صورت شکل ہی کیوجہ سے ناپسند کر رہی ہو۔ معاف کیجئے گا۔" مولانا نے صاف گوئی کے بعد کہا۔ "میرا اِس سے کوئی اور مطلب نہیں۔ سوائے اِسکے کہ ناپسند ہونے کے وجوہات میں کوئی ایک چیز مخصوص نہیں کیجا سکتی سب ہی چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔"

ابو الحسن صاحب بولے۔ "حنا من۔ مجھکو تسلیم ہے کہ میں خوبصورت یا بہت چھیلا اور فیشن ایبل جوان نہیں مگر یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نہ تو ایک اچھے شوہر کے لئے خوبصورت ہونے کی ضرورت ہے۔ اور نہ پھر بیوی ہی کو بعد شادی خیال ہوتا ہے کہ میرا شوہر بدصورت ہے' یہ سب لڑکیوں کا بچپنا ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حسین سے حسین لڑکی بھی اپنے بدصورت شوہر کو عزیز ترین شوہر سمجھتی ہے اور کسی اچھی سے اچھی صورت شکل والے سے کسی طرح اپنے شوہر کو کم نہیں سمجھتی اور نہ پھر کوئی بیوی ایسی ہے جو محض اپنے عزیز شوہر کی صورت شکل کیوجہ سے اپنا گھر بگاڑ دے۔ یہ سب بچوں کی باتیں ہیں جو محض عمر سے متعلق ہیں۔"

مولانا نے کہا۔ "ابو الحسن صاحب۔ آپ ذرا غور تو کیجئے کہ فریقِ ثانی فلاسفر نہیں اور جو

آپ نے فرمایا وہ صحیح بھی ہے تو میں یا آپ سمجھ سکتے ہیں نہ کہ ایک نوعمر لڑکی۔"
وہ بولے "بندہ پرور۔ بس اسی وجہ سے تو مجھے لڑکی کے ان خیالات کی چنداں پرواہ ہی نہیں ہے مگر پھر بھی آپ لوگوں کے خیالات کی پرواہ کرتا ہوں اور پھر ذمہ لیتا ہوں کہ لڑکی کو آرام سے رکھوں گا۔ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے والد کے پاس خدا کی دین سے سب کچھ ہے سوائے ایک بہن کے کوئی نہیں۔ بھائی معاف کرنا۔ شیخی نہیں بگھارتا۔ مجبوراً کہتا ہوں آج کل کی لڑکیاں اس بات پر غور نہیں کرتیں! حالانکہ اگر روپیہ پیسہ اور اطمینان نہ ہو تو گھر دوزخ ہو جاتا ہے اور باوجودیکہ میاں اور بیوی دونوں اچھی صورت شکل والے ہوں اور دوسرے کو پسند ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی صورت سے بوجہ مالی پریشانیوں کے بیزار ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر آپ اور آپ کی بیگم صاحبہ انکو اچھی طرح نشیب و فراز سمجھا دیں کہ میں انکو بڑی اچھی طرح رکھوں گا۔ آپ تو سمجھدار ہیں۔ بدصورت میاں تو بہترین شوہر ہوتا ہے یہ تو مثل مشہور ہے۔"
ہنستے ہوئے ابوالحسن صاحب نے کہا "وہ مجبوراً ہوتا ہے۔"
مولانا نے کہا "آپ صحیح ارشاد فرماتے ہیں مگر یہاں بحث طلب بات ہی اور ہے۔ القصہ آپ جانیں اور آپ کا کام۔ مگر میں صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ میری دانست میں آپ کو سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیے۔ میرا فرض ہے کہ آپ کو آگاہ کر دوں کہ یہاں تو اب یہ معاملہ ہے کہ فریق ثانی موت کو بدرجہا پسند کرتا ہے بہ نسبت آپ کے۔"
وہ مسکرا کر بولے "ماشاءاللہ۔"

مولانا بولے "اور پھر آپ فلسفیانہ ضد کرتے ہیں میری دانست میں۔۔۔ میری دانست میں اس بات کے علم سے خود آپ کے جذبۂ خودپسندی کو ٹھیس لگنا چاہیئے اور اسی بنا پر خود آپ کو ایسے شخص سے نفرت پیدا ہو جانا چاہیئے۔"

ابوالحسن صاحب ہنستے ہوئے بولے "مگر میں اس معاملہ میں اول درجہ کا بے حیا ہوں ضرورت سے زیادہ بے حیا..... ورنہ اور کوئی ہوتا تو جو باتیں میں نے سُنی ہیں اُن کی بناء پر کبھی کا اِس قصہ سے دست بردار ہو گیا ہوتا"

"پھر آپ کیوں اپنی ضد پر اَڑے ہیں؟"

وہ بولے "محض اس وجہ سے کہ مُجھکو پھر ایسی خوبصورت لڑکی نہیں ملے گی۔ ایسی اچھی لڑکی جو ہر فن میں طاق ہو اور خصوصًا گانا بہترین جانتی ہو۔ مُجھے ذرا گانے سے زیادہ شوق ہے۔ غرض جو لڑکی تمام سوسائٹی کا پھول ہو اسکو میں کیسے چھوڑ دوں! میں نے انکو دیکھا نہیں مگر ہاں تصویر ان کی روزآنہ دیکھتا ہوں اور وہ مُجھکو ضرورت سے زیادہ پسند ہیں"

"آپ کے پاس تصویر کہاں سے آئی؟" مولٰنا نے پوچھا۔

"یہ دیکھئے... بقول کسے در بغل" یہ کہکر اُنہوں نے تصویر نکالکر دکھائی اور کہا "یہ نہ بتاؤنگا کہ یہ کہاں سے آئی"

"ہیں! یہ آپ کہاں سے پا گئے؟" مولانا نے تصویر کو دیکھکر کہا "یہ تو میرے ہاتھ کا فوٹو ہے اور میری البم کا"

یہ کہکر مولانا اُٹھے اور اپنی البم دیکھی تصویر کی خالی جگہ دکھا کر مولانا بولے "کیوں جناب یہ میرے یہاں سے چوری! کیا میں آپ کی ہمشیرہ عزیزہ کو....."

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں" ابوالحسن بولے "میری بہن کے ذریعہ سے یہ مجھے نہیں پہونچی مگر ہاں مُجھکو یہ تسلیم ہے کہ یہ مالِ مسروقہ ہے۔ مگر چور نے مجھے نہیں بتایا کہ یہ کہاں سے اس تک پہونچی۔ آپ کی سہی مگر اب تو یہ میری ہے اور میں اِسکو کسی قیمت پر واپس نہیں دے سکتا اور نہ چور کا نام بتا سکتا ہوں"

قصہ مختصر مولانا نے اُنکو بہت کچھ سمجھایا اور اُنہوں نے مولانا کو سمجھایا۔ مولانا سے ابوالحسن صاحب نے بحث کرکر کے یہ وعدہ لیا کہ کوشش کرونگا لیکن اگر اُس نے پھر بھی نہ مانا تو مخالفت کروں گا۔

ابوالحسن صاحب چلے گئے اور کم از کم میں تو اُنکو اور بھی ناپسند کرنے لگی اور اُن کی باتیں سُنکر میری خوب ہی جان جلی۔ اب یہ طے ہوا کہ ابوالحسن صاحب کو ایک روز پھر بُلایا جائے تاکہ شاہدہ بھی اُنکو دیکھ لے۔ چنانچہ مولانا نے کہا کہ "پرسوں ہم اُنہیں تیسرے پہر کو بُلا لائیں گے اور تم اور شاہدہ دونوں کمرہ میں چق کے اندر سے ان کو خوب اچھی طرح دیکھنا اور رائے قایم کرنا"

(۴)

مولانا نے جب ابوالحسن صاحب سے پوچھا کہ بولو بردکھاوے کو چلوگے تو اول کی باچھیں کھل گئیں۔ فوراً راضی ہوگئے۔ یہ کہکر کہ "رہے قسمت" اور پھر شاہدہ کو بھی پوچھا کہ وہ ہونگی یا نہیں تو مولانا نے صاف نہ بتایا۔ بس یہی کہا کہ تمکو اس سے کیا مطلب کچھ لوگ تمکو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھی تھی کہ ابوالحسن صاحب بردکھاوے کا سُنکر آئیں گے تو شاید کچھ بن ٹھنکر مگر وہ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اُسی روز کی طرح اُجڑی کھسٹی صورت بنائے چلے آئے۔ یعنی باسی ڈاڑھی اور وہی روزانہ کی اچکن اور تیس روز کا میلا پاجامہ۔ یہ سب اس بنا پر جیسا کہ اُنہوں نے مولانا سے مسکرا کر کہا کہ گاہک کو مال بنا کر دکھانا ٹھیک نہیں"

القصہ وہ سامنے برآمدے کے چبوترہ پر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اور شاہدہ نے اچھی طرح اُن کو دیکھا اور سخت ناپسند کیا۔ شاہدہ نے کہا "بہن یہ تو بڑا بدتمیز ہے میں اِس غلام سے شادی تو بڑی چیز ہے چاہے جاں چلی جائے جُوتے تک نہ اٹھواؤں گی"

میں نے چپکے سے شاہدہ کا فیصلہ مولانا کے کان میں کہدیا اور انہوں نے جاکر ابوالحسن صاحب کے کان میں کہدیا۔ آخر یہ آدمی ہی تھے حالانکہ انہوں نے بھی چپکے سے مولانا سے کہدیا۔ "انشاء اللہ۔ کہیں خود یہ سعادت انہی کو نہ حاصل ہو جائے۔"

حالانکہ انکو محض دیکھنے ہی کے لئے بُلایا گیا تھا۔ مگر چائے پلائی گئی۔ اور مولانا سے خوب خوب بحث رہی مگر وہ بندۂ خدا ٹس سے مس نہ ہوئے وہ کسی طرح شاہدہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

(۵)

ابوالحسن صاحب کا پلہ بھاری تو ہو ہی چکا تھا مگر اب اور بھی سونے پر سہاگہ ہوا۔ شاہدہ کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے بھی اس رشتہ کو بہت پسند کیا۔ مگر ہماری موجودہ سوسائٹی کی لڑکیوں کی آزاد روش کو دیکھتے ہوئے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ یہ شادی معلوم کیا نہ کچھ رنگ لائے گی۔

شاہدہ میرے یہاں آکر آکر روتی تھی اور کہتی تھی کہ کوئی تدبیر نکالو۔ پھر شاہدہ کے باپ بھی یہ سب کچھ جانتے تھے مگر سب قدامت پرستی پر تُلے ہوئے تھے۔ میں جو کچھ کر سکتی تھی کر تھکی تھی مگر سب بیکار۔

مولانا خود ابوالحسن صاحب کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے پھر نوبت خوشامدوں پر پہونچی مگر ابوالحسن اٹل تھے۔ دن ہوا کی طرح گذر رہے تھے اور میری خود کی حالت شاہدہ کی مصیبت کو دیکھ دیکھکر ابتر ہوتی جاتی تھی۔ مولانا تھک کر تنگ آچکے تھے۔ تنگ آمد بجنگ آمد میں نے ایک آخری کوشش کی ٹھان لی اور مولانا سے کہا کہ "ابوالحسن صاحب سے میں خود ملنا چاہتی ہوں۔ میں بالمشافہ اون سے ملکر باتیں کرونگی ایک روز بُلا لاؤ۔" یہ میں نے اس وجہ سے

ابوالحسن صاحب سے کہلوایا کہ وہ کئی بار مجھ سے کہلوا چکے تھے کہ شاہدہ سے انکو پانچ منٹ کے لئے ملوادوں۔

جب مولانا نے ابوالحسن صاحب سے میری طرف سے ملاقات کا پیغام دیا تو وہ فوراً راضی ہو گئے اور خوش ہو کر مولانا سے بولے "فتح ہے"

(۶)

اسی آخری گھنٹی بیچ دبیچ سے ابوالحسن صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ مولانا نے رسمی تعارف کرایا بعد علیک سلیک قبل اسکے کہ میں کچھ کہہ سکوں وہ بولے۔

"میں اُمید کرتا ہوں آپ اپنی سہیلی سے میری سفارش کریں گی"

میں نے کچھ ترش روئی سے کہا کیونکہ جلی ہی بیٹھی تھی:۔

"مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ تعلیم یافتہ ہوکر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو ویسے ہی مویشی سمجھ رکھا ہے اور پھر یہ کہ آپ کے سے نوجوان اسکے ساتھ وہ برتاؤ کرنے سے دریغ نہیں کرتے جو وحشی قومیں بھی روا نہیں رکھتیں۔ کیا آپ اپنے اس فعل کی تائید کسی طرح بھی کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ظلم دُنیا کے پردہ پر سوائے ہندوستان کے کسی بھی تہذیب یافتہ ملک میں ممکن ہے؟"

ابوالحسن صاحب کچھ سٹ پٹا سے گئے۔ رُک کر بولے "میری عزیز بہن آپ کا فرمانا بجا اور درست ہے مگر میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ ہندوستان کے سے ملک میں یہ تمام باتیں مجبوراً کرنا پڑتی ہیں"

میں نے کہا "وہ کون سی مجبوری ہے؟ ذرا صاف کیجئے کیا مطلب ہے آپ کا"

ابوالحسن صاحب نے کہا "یہ کہ آپ کی سہیلی صاحبہ سے میں نہیں مل سکتا۔ اس سے زائد ظلم

نہ تو اُنکے ساتھ ممکن ہے اور نہ میرے ساتھ۔ وہ میرے بارہ میں اچھے خیالات نہیں رکھتیں۔ اُن کے اِن خیالات کی وقعت میرے دل میں کیونکر ہو جب اُنکے اور میرے درمیان میں پردے نہیں دیواریں حائل ہیں۔ مجھ سے ملنے کے بعد اور میری عرض داشت سُننے کے بعد اگر وہ مجھکو نامنظور کر دیتیں تو اونکے فیصلہ کی میرے نظروں میں کچھ وقعت بھی ہوتی۔ مگر موجودہ صورت میں کس طرح میں یقین کر لوں کہ اُنکا فیصلہ صحیح ہے اور یہ کہ خود اُنکی ہی نظرِ ثانی کا محتاج نہیں۔ اُنکا فیصلہ اِدھر اُدھر کی غیر معتبر شہادت کے اوپر مبنی ہے لہذا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اونکا فیصلہ غلط ہے مجبوراً ہندوستان میں اسی طرح کام چل رہا ہے اور چلتا رہیگا۔"

بات تو دراصل یہ ہے کہ ابوالحسن صاحب نے بڑی باریک بات نکالی تھی مگر میں نے ایک نہ سُنی اور کہا "میں آپ کو یقین دِلاتی ہوں کہ اونکا فیصلہ صحیح اور اٹل ہے اور کسی نظرِ ثانی کا محتاج نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ ایک نوعمر لڑکی کو زندہ درگور نہ کریں۔ خدا کے لئے رحم کیجئے خدا کے غضب سے ڈریئے مظلوم کی آہ خالی نہیں جاتی خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ظُلم کی ٹہنی کبھی نہیں پھلتی۔ اسکو آپ قبل از وقت لقمۂ اجل بنا رہے ہیں۔"

ابوالحسن صاحب قطعی متاثر نہ ہوئے بلکہ ہنس کر بولے "آپ کا خیال غلط ہے۔ میں گارنٹی کرتا ہوں کہ وہ اچھی طرح رہیں گی، خوب تندرست اور موٹی تازی پیشتر سے سوا ہو جائیں گی۔ بیمار تک نہیں پڑیں گی۔"

میں نے اِس مزاحیہ حملہ پر کچھ توجہ نہ کی اور اُن سے کہا "اُسکو زبردستی شادی پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ شرع کی رُو سے یہ شادی نہیں ہوتی۔"

مگر ابوالحسن صاحب مجھ سے کہیں زیادہ قانون جانتے تھے اور بولے "بہتر ہے کہ ایجاب قبول کے موقعہ پر وہ اِنکار کر دیں۔ ورنہ اگر اُنھوں نے "ہوں" یا "ہاں" کہہ دیا تو شرعاً وہ جائز شادی

ہو گی۔ کچھ بچے تو ہیں نہیں۔ بس یہی مفر کی صورت ہے"
میں نے کہا "اور کوئی نہیں؟"
"کوئی نہیں"
کوئی نہیں؟" پھر میں نے کہا "کیا آپ کی دانست میں اور کوئی نہیں؟... آپ غلطی پر ہیں۔ ایک مظلوم ان تمام قصوں پر دوسری طرح ہی فتح پا سکتی ہے"
ابوالحسن صاحب سمجھ گئے کہ میرا کیا مطلب ہے۔ اور بولے "حرام موت دوسری مفر کی صورت ہے اور اُسکا عذاب آپ کی گردن پر... آپ سمجھدار ہوکر ایسی باتیں کر رہی ہیں"۔
فلسفیانہ انداز میں ابوالحسن صاحب بولے "آپ کی زباں سے اور پھر ایسی باتیں! آپ کو چاہیئے کہ آپ خود انکو سمجھائیں نہ کہ ورغلائیں۔ آخر آپ مجھ میں کیا خرابی پائیں ہیں"
"وہ یہ" میں نے کہا۔ "وہ یہ کہ آپ شاہدہ کو سخت ناپسند ہیں اور پھر اب تو معلوم ہوا کہ آپ حد درجہ کے ظالم بھی ہیں بلکہ معاف کیجئے گا آپ کا ظُلم مدرجۂ سفا کی پھوپچتا ہے کیونکہ آپ تعلیم یافتہ ہوکر اور یہ جانتے ہوئے کہ عورتوں کی حالت ہندوستان میں بد سے بدتر ہو رہی ہے ایسی باتیں کرتے ہیں! لہٰذا میری دانست میں تو آپ کو کوئی سمجھدار لڑکی ہی پسند نہ کریگی"
ابوالحسن صاحب اس طعن کو سُنکر ہنسنے لگے اور بولے "پھر ایک دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اپنی سہیلی سے بس صرف دس منٹ کے لئے ملوا دیجئے"۔
"آپ اُن سے ملکر کیا کریں گے اور کیا نتیجہ نکلے گا؟ بالفرض آپ اُن سے ملیں بھی اور وہ آپ کو نامنظور کر دیں تو کیا آپ مان جائیگا؟"
وہ بولے "میرا خیال تو یہی ہے کہ میں ضرور مان جاؤنگا مگر قطعی نہیں کہہ سکتا کیونکہ موجودہ صورت میں وہ جو مُجھ سے ملیں گی تو فیصلہ کرنے کے بعد ملیں گی گویا اپنی رائے بدلنے کا خیال

ہی اُن کو نہ ہوگا ۔"

میں نے کہا "آپ تو کسی بات پر جمتے ہی نہیں۔ اگر آپ کو منظور ہے کہ آپ اُنکی زبان سے اُنکار سُنیں تو کل ہی سُن لیجئے ۔"

ابوالحسن صاحب نے کچھ سوچا اور پھر کچھ رائے بدلکر بولے ۔"مجھکو منظور ہے ۔ آپ میری اُن کی ملاقات کرا دیجئے۔ اگر وہ اِنکار کردیں گی تو میں دست بردار ہو جاؤں گا ۔" میں نے خوش ہو کر خوشامدانہ لہجہ میں کہا ۔" خدا کے لئے اُسپر رحم کیجئے۔ عمر بھر وہ آپ کو دعائیں دیں گی۔"

ابوالحسن صاحب بولے کہ "آپ کون ہوتی ہیں اب جو اُن کی طرف سے اپیل کریں۔ اب ہم جانیں اور وہ ۔"

میں نے کہا " قولِ مرداں جان دارد ۔"

" قولِ مرداں جان دارد ،" ابوالحسن صاحب مسکرا کر بولے " بہ ربّ کعبہ بشرطیکہ آپ نہ ورغلائیں۔"



شاہدہ کسی طرح اس ملاقات پر راضی ہی نہ ہوتی تھی۔ اُسکی تمام تیزی اور شرارت غائب ہو چکی تھی، وہ جسم بے روح ہو کر رہ گئی اور مارے فکروں کے گھلی جا رہی تھی۔ وہ کہنے لگی "بہن تو کیوں مجھے ذلیل اور رُسوا کرتی ہے۔ وہ ایک موذی ہے۔ وہ تو میری جان لیگا۔"

غرض وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ مگر میں نے وقت مقرر کردیا اور اُسکو جا کر گھر سے پکڑ لائی۔ پھر اُسی اُجڑے حُلیہ سے ابوالحسن صاحب تشریف لائے۔ شاہدہ نے عین موقعہ پر ملاقات سے انکار کردیا مگر میں نے اور مولانا نے اُسکو زبردستی کُرسی پر لا بٹھایا۔

میں کیا بتاؤں کہ اُسکا کیا حال تھا۔ ہیں! یہ وہی شاہدہ تھی۔ آفت کا پرکالا! شرارت کی پوٹ!

جواب بھیگی بلی سے بدتر تھی !

ابوالحسن اپنی ناراض منگیتر کو دیکھتے ہی سروقد کھڑے ہو گئے۔ کچھ یونہی سی شاہدہ نے منہ چھپانے کی کوشش کی۔ میں ٹھوکے پہ ٹھوکے دے رہی تھی اور ملی ہوئی بیٹھی تھی۔ مولانا اس گھبراہٹ کے عالم میں چائے بنا رہے تھے۔

ابوالحسن صاحب نے چائے کی پیالی بنا کر زور سے سورۂ اخلاص پڑھ کر پیالی پہ دم کیا اور شاہدہ سے کہا: "اسکو اللہ شافی کر کے پی جائیے"۔ مجھے بیحد ہنسی آئی کیونکہ ابوالحسن کی پوزیشن انکا اُجڑا حلیہ یہ سب چیزیں اور یہ مذاق۔ مگر شاہدہ بُت کی طرح آنکھیں نیچی کئے بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا میں نے کہا بھی کہ "کمبخت کیا تجھے سانپ سونگھ گیا"۔ چائے کی پیالی پر اور میرے ہنسنے پر اُس کے چہرہ پر اور ہوائیاں اُڑنے لگیں، کان میں میں نے اُس کے کہا: "جب تجھ سے پوچھیں کہ میرے ساتھ شادی منظور ہے تو پھٹ سے انکار کر دیجو"۔

مجھے بھی ابوالحسن صاحب نے چائے دی اور مولانا بھی بیٹھ گئے چائے پی جانے لگی مگر شاہدہ نے انکار کر دیا بڑی مشکل سے اُسنے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی۔ اتنے میں ابوالحسن صاحب نے بغیر کسی تمہید کے شاہدہ سے سوال کر دیا "آپ مجھ سے اس درجہ کیوں ناراض ہیں؟"

میں بول اٹھی "ناراض واراض کچھ نہیں ہیں"۔

"براہ کرم درمیان میں آپ نہ بولیں"۔ ابوالحسن صاحب نے کہا اور پھر شاہدہ سے پوچھا۔

"آپ مجھ سے اسدرجہ کیوں ناراض ہیں؟"

میں نے اور چٹکی لی کہ جلدی بول۔ شاہدہ نے کہا: "جی نہیں"۔

"آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں نا"۔ ابوالحسن صاحب بولے۔

میں نے پھر چٹکی لی تو پھر شاہدہ نے کہا: "جی نہیں"۔

"میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں" جھک کر شاہدہ سے ابوالحسن صاحب نے کہا اور پھر میری طرف دیکھکر کہا "بہن صاحبہ تسلیم"

میں چونک سی پڑی اور ابوالحسن صاحب کے "شکریہ" اور "تسلیم" کے معنی اب سمجھی۔ میں نے گھبرا کر چائے کی پیالی رکھدی۔ شاہدہ کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ ابوالحسن صاحب کو دیکھا تو انکے چہرہ پر کامیابی کی مسرت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس چالاکی پر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور میں نے جھلا کر کہا "آپ سنجیدگی کو چھوڑکر مذاق کی طرف متوجہ ہیں آپ خواہ مخواہ کسی کی شرم وحیا سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں" پھر شاہدہ سے میں نے کہا "دیکھتی کیا ہے کمبخت پتھر بنی بیٹھی ہے۔ پھوٹتی نہیں کہ میں تمہیں ہرگز پسند نہ کرونگی ......"

"احتجاج" ابوالحسن صاحب چلا کر بولے "ہیں! ہیں! یہ کیا! یہ کیا جناب .... واہ آپ کون! ....."

میں نے جلکر کہا "بہتر ہے کہ یہ بات یہیں کی یہیں ختم ہو جائے" اور اتنا کہکر شاہدہ کا ہاتھ پکڑ کر میں نے پردہ میں کر دیا اور پھر ابوالحسن صاحب سے غصہ سے کہا "آپ ایک بیگناہ کی جان لینے پر تلے ہوئے ہیں"

آخری الفاظ مشکل سے میری زبان سے نکلے مارے غصہ اور رنج کے میری آواز گھٹ گئی اور میں بھی پردہ میں چلی گئی اور شاہدہ سے لپٹ کر آنسو بہانے لگی۔

ابوالحسن صاحب مولانا سے معافی مانگنے لگے اور تمام تر اس سین کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا۔ مولانا نے ابوالحسن صاحب سے کہا کہ لفظی گرفت کوئی چیز نہیں۔ آپ الفاظ سے کھیل رہے تھے!

ابوالحسن صاحب تیز ہو کر بولے "یہ عجیب ستم ہے۔ الفاظ کی وقعت آپ خود نہیں کرتے اور مجھ سے کرانا چاہتے ہیں بالمشافہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ مجھ سے ناراض نہیں یعنی راضی ہیں۔ شادی

پر، اور پھر کوشش کی جاتی ہے کہ میں یقین کر لوں کہ مجھ سے راضی نہیں ہیں"۔

(۸)

قصہ مختصر ابوالحسن صاحب جیتے اور ہم ہارے۔ میں نے کہا آپ تحریر پر راضی ہو جائیں مگر تحریری وعدہ میں انہوں نے شرایط اتنی لگائیں کہ ناممکن تھا کہ کوئی تصفیہ ہو سکے۔ جلسہ برخاست ہونے لگا تو میں نے ابوالحسن صاحب کی بے انتہا خوشامد کی اور دردناک لہجہ میں اپیل کیا مگر وہ یہ کہکر انکار کر گئے کہ میں نے اپنے کان سے اور اُنکی زبان سے فیصلہ اپنے حق میں سُن لیا۔ اب مجھکو کسی کی سفارش کا اعتبار نہیں۔

میں بہت کچھ شاہدہ سے کہتی رہی کہ اری کمبخت نکلکر ایک دفعہ کہہ تو دے مگر اوس کا کہنا ٹھیک تھا وہ کہنے لگی کہ "یہ کہیں گے کہ تمنے بہکا دیا ہم نہیں مانتے تب کیا جواب ہوگا"۔

ابوالحسن صاحب چلے گئے میں شاہدہ سے خوب گلے ملکر روئی اور کر ہی کیا سکتی تھی۔

اور یہ ہماری آخری کوشش تھی۔ "کیا واقعی شاہدہ کی قسمت میں اب گڑ کے لڈو ہی رہ گئے" میں سوچتی تھی اور افسوس کرتی تھی۔

باب (۱۳)

انجامِ نفرت

وقتاً فوقتاً فیروزہ کے خط سے اُس کی شادی کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ دراصل بہت کچھ طے ہو چکا تھا اور بات اب اسپر اٹکی تھی کہ پڑھائی ختم کرنے کے بعد نکاح ہو یا پہلے کیونکہ فیروزہ کی پڑھائی میں ابھی پورے دو سال باقی تھے۔ فیروزہ کے والد صاحب کا خیال تھا کہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد نکاح ہو لیکن خود بی فیروزہ کا خیال تھا کہ نکاح اب ہو جائے اور شادی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہو مگر اس کا سوائے میرے اور کسی کو بھلا کیا پتہ۔ دراصل بی فیروزہ بھی کچھ گڑبڑ کے مزے چکھے ہوئے تھیں اور چاہتی تھیں کہ معاملہ پختہ یعنی نکاح ہو جائے کیونکہ منگنی تو ہی چکی تھیں۔ ایک لڑکی کے لئے شاید اس سے زیادہ اور کوئی تکلیف دہ امر نہیں کہ سال ڈیڑھ سال وہ ایک کی منسوبہ بنی بیٹھی رہے اور بعد میں قسمت چھوٹ جائے۔ چنانچہ فیروزہ کا خیال تھا کہ میں شاید اُنکی والدہ کو تحریر کر سکوں۔ لمبے چوڑے خط فیروزہ کے آرہے تھے اور یہی باتیں درپیش تھیں میں نے فیروزہ کی والدہ صاحبہ کو چنانچہ خط بھی لکھا تھا۔ وہاں سے عجیب جواب آیا۔ وہ یہ کہ اُنہوں نے یہ لکھا کہ خود فیروزہ کی یہی مرضی ہے کہ بعد پڑھنے کے شادی ہو۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ درپردہ تو یہ بات تھی لیکن تکلف میں آکر بی فیروزہ نے بھی کہہ رکھا تھا چنانچہ اُنکی ماں نے جس کے ذریعہ سے

فیروزہ کا عندیہ لینا چاہا اُن سے فیروزہ نے دل کی بات نہ بتائی بلکہ یہی کہدیا تھا کہ ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں (یعنی نکاح بعد پڑھائی کے ہو)

جوں جوں بی فیروزہ کو یہ رشتہ پسند ہوتا جاتا تھا یہ اندیشہ بھی بڑھتا جاتا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ چنانچہ اب مُجھ سے صلاح و مشورہ کے لئے ملنا چاہتی تھیں بلکہ آنے ہی والی تھیں کہ ایک دم سے تجویز پلٹ دی اور دُور کی سُوجھی۔ وہ یہ کہ بمبئی میں ایک پارسی خاتون رہتی تھیں ایک طرف اگر وہ فیروزہ کی ازدار بہن تھیں تو دوسری طرف فیروزہ کی ماں کی نہایت ہی بے تکلف ملنے والیوں میں تھیں اور فیروزہ کی نظر اونیر پڑی۔ ایک آدھ خط لکھا۔ بمبئی والوں کی عادت ہے کہ وہ بُلاوا دینے میں صرورت سے زیادہ فراخدلی کرتے ہیں۔ شاید سوچا کہ کوئی نہ آئے گا مگر فیروزہ کو تو اون سے کام لینا تھا۔ فوراً راضی ہوگئی اور اُس سے کہا کہ گھر خط لکھکر اجازت اور روپیہ دلوا دو۔

فیروزہ روشن خیال ماں باپ کی تعلیم یافتہ اور اپنی ذمہ داری محسوس کرنیوالی لڑکی ٹھہری۔ تنہا سفر کرنا اُس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی اور باپ نے اجازت دیدی۔ چنانچہ میرے پاس خط آیا کہ یہ یہ معاملہ ہے اور اس طرح بمبئی جا رہی ہوں تاکہ کوشش کروں کہ جلد سے جلد نکاح ہو کر معاملہ بالکل پختہ ہو جائے اور لگی لگائی شادی چھوٹ جانے کا دھڑکا جاتا رہے کہاں تو مُجھ سے ملنے والی ہو رہی تھیں اور کہاں بمبئی کا سفر اختیار کیا۔ مُجھے لکھا کہ بمبئی سے واپسی میں تم سے بھی ملوں گی۔

اس خط کے ساتویں روز کا ذکر ہے کہ ایک دم سے تار آیا کہ شام کو پہونچونگی میں خود اسٹیشن پر لینے گئی۔ گاڑی سے آتارا اور ویٹنگ روم میں لاکر اتنے دن کی جدائی کی بھڑاس

نکالی۔ مولانا سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ دونوں طرف سے نہایت ہی خشک قسم کا رُوکھا سا
سلام ہوا۔ اور کسی نے بھی دوسرے کی طرف نظر تک نہ اٹھائی۔ گھر پر لائی۔ اوہ! کتنی مجھے باتیں
کرنا تھیں! مگر فی الحال تو بمبئی کے مشن کا نتیجہ پوچھنا تھا کہ کہاں تک کامیاب رہا۔ بجائے اس
کے کہ دو حرف کہدیتی کہ بمبئی جانے کا کیا نتیجہ رہا اُسنے چُپ سی ہو کر کہا کہ تم میرا پورا قصہ سنو۔
اور بتاؤ کہ اب کیا کروں۔ چُنانچہ بی فیروزہ نے اپنا قصہ اب اس طرح بیان کیا۔

(۱)

"... آگرہ فورٹ سے میں نے سکنڈ کلاس کا بمبئی کا ٹکٹ لیا اور زنانہ درجہ میں
بیٹھ گئی۔ بھرتپور پہونچکر پنجاب میل ملا۔ میرے ساتھ بہت مختصر اسباب تھا۔ ایک بستر ایک
ناشتہ دان کی ٹوکری اور ایک سُوٹ کیس۔ گاڑی میں سب چیزیں قرینہ سے لگا کر میں نے اپنی
سیٹ پر بستر لگا لیا۔ بھرتپور پر دو تین اخبار لئے تھے درجہ میرا بالکل اکیلا تھا اور میں اطمینان سے
اخبار پڑھنے بیٹھ گئی۔ پھر اِس خیال سے کہ وقت کیوں ضائع کروں کلاس کی ایک کتاب نکالکر
پڑھنے لگی۔ پھر سو گئی۔

شام کا وقت آیا۔ کچھ خُنکی سی محسوس ہوئی تو میں اٹھی اور بُرقعہ اُتار کر سرہانہ رکھکر بستر میں
نہایت ہی اطمینان سے کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئی۔
گاڑی بیانہ اسٹیشن سے گذر چکی تھی۔ شام کا وقت تھا اور بی۔ بی اینڈ سی۔ آئی کا ڈریڈناٹ
اِنجن گاڑی کو ہوا کی طرح اُڑائے لئے جارہا تھا۔ کس قدر پُرلطف سفر تھا میرے لئے یہ تنہائی باعثِ
فرحت تھی۔ میں اپنے اور اپنے مشن کے خیالات میں غرق تھی۔ کتاب میں نے رکھدی تھی اور کھڑکی
سے باہر میری نظر تھی۔ کیا ہی پُرلطف سفر ہے میں نے دل میں کہا کس ناقابلِ بیان سُرعت کے

ساتھ بجلی کی طرح گاڑی سنساتی ہوئی جا رہی تھی، دور دور آبادی کا پتہ نہ تھا اور سارا علاقہ بنجر اور وحشت سنگلاخ تھا جو تیزی سے جیسے پھیلتا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور رات تھی۔ بڑی دیر تک میں کلاس کی کتاب پڑھتی رہی۔ جب رات زیادہ آئی تو میں نے کچھ ہلکا سا ناشتہ کیا۔ جوتہ اتارا اور بہ اطمینان سے کتاب ہاتھ میں لیکر لیٹ گئی۔

اتنے میں ہوا کے سرد جھونکے تکلیف سی دینے لگے اور میں نے اوٹھکر سوائے ایک کے سب کھڑکیاں بند کر دیں۔ بڑی دیر تک مجھے نیند نہ آئی اور میں کتاب پڑھا کی۔ جیسا میں کہہ چکی ہوں یہ سفر میرے لئے بیحد خوشگوار رہا مگر اسوقت مجھے ایک عجیب غریب سے چینی محسوس ہوئی اتم جاتی ہی ہو کہ میں عورتوں میں نڈر ہوں۔ مُردے چیرتی ہوتی ہوں ڈر سے مجھے کیا تعلق۔ مگر رات کی یہ عجیب غریب تنہائی اور پھر یہ احساس کہ اندھیری رات میں ریل گاڑی ایک مہیب اور جوبی دیو کی طرح چیختی چیگھارتی بل کھاتی اور سنسان جنگلوں اور ہیبت ناک پہاڑوں میں گونجتی دندناتی چلی جا رہی ہی۔ ریل کا مسلسل اور یکساں شور! اور اُسکی رفتار کا زناٹا! میرے لئے اسوقت ایک عجیب ہی سناٹے کا عالم پیدا کر رہا تھا! میں نے کتاب سے نظر ہٹا کر چھت کی طرف دیکھا پھر چاروں طرف دیکھکر کھڑکی سے باہر جو نظر ڈالی تو ایک عجیب غریب اور نا قابل بیان وحشت سی معلوم ہوئی میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ جیسے تاریکی کا بھوت گاڑی کے ساتھ ایک عجیب غریب شیطنت کے ساتھ تمسخرانہ انداز سے دوڑ رہا ہے گاڑی کی کھڑکی میں سے ہیبت ناک تاریکی مہیب دکھائی دے رہی ہے بلکہ گویا بھیانک تاریکی خود میرے ڈبہ میں جھانک رہی ہے! مگر میں پھر بے توجہ ہو کر کتاب پڑھنے لگی۔ میں کلاس کی ایک کتاب متعلق تشریح پڑھ رہی تھی۔ اس میں ایک انسانی ڈھانچہ کی تصویر تھی

جیسے ہی میری نظر اُسپر پڑی میں بے تیزی سے صفحہ لوٹ دیا فوراً کتاب رکھکر کھڑکی کی طرف دیکھا، بڑی بھیانک اور تاریک رات تھی اور بیشک تاریکی کا عفریت میری کھڑکی میں مُنہ ڈالے جھانک رہا تھا!

مگر میں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ کتاب البتہ رکھدی اوراب اخبار پڑھنے لگی۔ پریشان خیالات دل سے قریب قریب نکل چکے تھے کہ میری نظر اخبار کے کالم کی ایک خونی سُرخی پر پڑی ایک دم سے میرا دل ہل گیا! تن بدن کے روئیں کھڑے ہوگئے! تاریکی اور زیادہ ہیبت ناک معلوم دینے لگی! کیونکہ اخبار کی سُرخی ہی ایسی تھی......."ریل میں قتل"....... میں سہم سی گئی اور چارو ناچار مضمون پڑھنا پڑا۔

اس مضمون کے پڑھنے کے بعد میری حالت ہی اور تھی۔ میں نے چاروں طرف لیے ڈبہ میں مشکوک اور وحشت ناک نظریں ڈالیں ڈرتے ڈرتے اپنی بنچ کے نیچے دیکھا کہ کہیں کوئی خونی ڈاکو تو نہیں بیٹھا ہے وحشت اور زیادہ ہوئی اور طرح طرح کے شُبہ دل میں آئے۔ اُٹھکر میں نے غسل خانہ کو دیکھا یہ سب میں نے مضمون پڑھکر کیا کیونکہ اس مضمون نے مُجھے پریشان کردیا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ ایک یورپین لیڈی جو سکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبہ میں کلکتہ سے دہلی آرہی تھی راستہ میں قتل کردی گئی۔ معلوم کس نے قتل کیا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پولیس سراغ لگا رہی ہے۔

معًا مجھے خیال آیا کہ میرے بارہ میں بھی پولیس سراغ لگاتی ہی رہ جائے گی۔

مُجھے اب یاد آیا کہ اس قسم کی خبریں میں بیشتر ہی پڑھ چکی ہوں مگر یہ موقعہ اور تھا۔ میں کبھی ڈرنے والی نہیں مگر اسوقت میں نے محسوس کیا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

کھُلی ہوئی کھڑکی کی طرف میں بار بار دیکھ رہی تھی۔ اپنی کمزوری پر ہنسنے کی بھی کوشش کی اور دل کو مضبوط کرنا چاہا مگر سب بیکار۔ اب میں پریشان ہوکر اُٹھ بیٹھی چاروں طرف

غور سے دیکھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ریل کی رفتار میں کچھ کمی محسوس ہوئی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ میں نے سر کھڑکی سے نکالکر دیکھا اسٹیشن کا نام میں نے لالٹین کے شیشہ پر پڑھا۔ کچھ خیال آیا۔ ٹائم ٹیبل اٹھا کر دیکھا اور حساب جو لگایا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کس قدر غیر آباد علاقہ ہے کہ اب دوسرا اسٹیشن پورے گھنٹہ بھر بعد آئیگا۔ اور پھر اس کے بعد جو گاڑی چلے گی تو قریب قریب پورے دو گھنٹے بعد رُکیگی۔

گاڑی چلی اور اسٹیشن آنے سے جو ڈر لگنا بند ہو گیا تھا ہلکا پھر احساس ہونے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری وہی حالت ہو گئی اب میں ایسا اطمینان کرنے اُٹھی اور باہر جھانک کر اپنے ڈبہ کے پائیدانوں کی طرف غور سے دیکھا کہ اگر کوئی چلتی گاڑی میں دوسرے ڈبہ سے آنا چاہے تو آسکتا ہے یا نہیں۔ ڈبہ کے پائیدان ایسے تھے کہ چلتی گاڑی میں برابر والے ڈبہ سے کسی کا آنے کی کوشش کرنا اپنے کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کم نہیں۔ اب میں نے کھڑکی بند کرنے کی ٹھان لی گو کہ میں جانتی تھی کہ کھڑکی بند کرنا بیکار ہے کیونکہ دروازہ کھولنے کا ہینڈل باہر ہی تھا مگر میں مجبور تھی کیونکہ باہر ایک وحشت انگیز سماں تھا۔ چاروں طرف ایک نحوست سی طاری تھی اور بیابان سائیں سائیں کر رہا تھا اور اسی کھڑکی کھلے رہنے سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ چنانچہ میں کھڑکی بند کر کے اپنے بچھونے پر آگئی اور کتاب سرہانے رکھکر سونے کے لئے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر تک تو ڈر کیوجہ سے نیند نہ آئی مگر آخر کار رفتہ رفتہ ڈر اور وحشت پر غالب آئی اور میں سو گئی۔"

فیروزہ نے کس طرح اتنا قصہ سُنایا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اُسکی خوبصورت اور چمکدار آنکھوں میں سپیدگی سی ہوئی تھی اور چہرہ کا صاف اور شفاف رنگ بالکل ساکن تھا۔ جیسے کوئی منجمد تال ہوتا ہے جس کا گہرا پانی عموماً خاموش ہوتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائی کی

تہا، پر میں پوچھنا چاہتی تہی اور کچھ بے چین ہو کر پوچھنا ہی چاہتی کہ اس نے فوراً ہی اپنے قصہ کو آگے بڑہایا۔

(۲)

"۔۔ میں سو گئی تہی ۔۔ کتنی دیر تک میں سوتی رہی میں کہہ نہیں سکتی۔ میں سو رہی تہی اور غافل سو رہی تہی کہ میں نے اپنی گردن کے پاس کچھ سوتے اور کچھ جاگتے میں میں نے ایک ٹھنڈک سی محسوس کی بیخودگی کے عالم میں کچھ میں کلبلائی اور کمبل کو سر پر کرنے لگی کہ یکایک مجھے واقعہ کی اصلیت کا علم ہوا!۔۔۔۔ میرے منہ سے مارے ڈر کے ایک چیخ نکل گئی کیونکہ یہ واقعہ تہا کہ ایک یوریشین گارڈ میرے منہ پر ہاتھ رکھے تہا!

میں اوچھل پڑی اور جھٹک کر اپنا منہ کمبل میں چھپا کر بیٹھ گئی۔ اسکے جواب میں ایک خوفناک غراہٹ کی آواز آئی اور اس کمبخت نے اس زور سے کمبل پکڑ کر جھٹکا کہ میرا سر اور چہرہ کھل گیا۔ اس نے میرا بایاں ہاتھ اپنی آہنی گرفت میں لیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے بس میری کلائی ٹوٹی۔ میں نے اپنا سر دوسرے ہاتھ سے ڈہکا اور منہ اپنا کمبل اور گھٹنوں میں چھپا لیا۔ میرا دل بلیوں اوچھل رہا تہا اور ڈر کے مارے میرا برا حال تہا۔"

میں بیکل ہو کر بیچ میں بول اٹھی اور میں نے کہا "بہن پھر کیا ہوا جلدی بیان کرو خدا کے لئے؟"

فیروزہ نے کہا "تم اطمینان سے قصہ سنو۔ گھبراؤ مت۔۔۔۔۔ وہ موذی اسی طرح میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے تہا کہ اب اسنے اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا سر اٹھایا اور پہر میرے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی تو کمبخت نے زور سے میرا ہاتھ جھٹکا اور غصہ ہو کر کہا "اگر چیخے گی تو مار ڈالوں گا!"

"کیا بتاؤں ہیں میری جان ہی نکل گئی جب یہ کہتے ہوئے اوس نے بڑا سا چاقو نکالکر دکھایا اور پھر کہا "مار ڈالوں گا جو آواز نکالی"۔

میں اب ایسی سہم گئی کہ گویا جان نکل گئی' اُس نے مجھے اِس طرح دیکھکر چاقو سامنے والی بیچ پر رکھدیا اور اب میرے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے اُس کے قرب سے اسقدر نفرت ہوئی اور اس قدر ڈر لگا کہ بیان سے باہر۔ مارے پریشانی کے میرے مُنہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور اب میں کونے کی طرف اپنے کو کمبل میں لپیٹ کر سکڑ گئی کہ جسقدر بھی اُس مجسم گندگی سے دور ہو سکوں بہتر ہے۔ اِس کے جواب میں۔ ہاتھ تو میرا اس کی گرفت میں تھا ہی۔ اُس نے مجھے جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف گھسیٹا۔

ڈر کے مارے اب چیخ تو میں نکال نہ سکتی تھی لہٰذا میں نے بھی انتہائی زور لگا کر اُس موذی سے علیحدہ ہی رہنا چاہا اور ہمت کر کے اب میں نے گویا بالکل ہی مدِمقابل ہو کر کہا "تم مجھے مارو نہیں میں تمہیں سب روپیہ پیسہ جو میرے پاس ہے دیدوں گی"

ہیں نے دیدہ ودانستہ یہ کہا تھا۔ گویا تجاہلِ عارفانہ۔ اور اِسپر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُوس کا منحوس چہرہ اور بھی زیادہ مسخ ہو گیا اور گھڑگھڑاتی ہوئی نہایت ہی کریہہ آواز میں اُس نے کہا "بی بی مجھے روپیہ نہیں چاہیے"

اِدھر اُوس نے یہ کہا اور اُدھر میں نے دیکھا. . . اُسکی آنکھوں سے شیطنت اور خباثت کے شرارے نکل رہے تھے!

میں نے پوچھا کہ "جب روپیہ آپ کو نہیں لینا ہے تو پھر مجھے کیوں مارتے ہیں؟"

اس کا جواب اُس خبیث نے یہ دیا کہ "اگر تم چلاؤ گی تو دیکھو وہ چاقو رکھا ہوا ہے۔ تمہارا گلا کاٹ ڈالوں گا۔ اور چپ رہو گی تو کچھ نہ کہوں گا"!

میں نے اس کا جواب دیا "خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیجئے۔ . . ٹکٹ"
"میں کیا بتاؤں بہن اُس نے اِس کا کیا جواب دیا" اس نے کہا۔
"بی بی نہ ہم ٹکٹ مانگتے ہیں اور نہ روپیہ" یہ کہکر کہا کہ "ہم تو تم کو مانگتے ہیں" اور ساتھ ہی میری گردن میں ہاتھ ڈال کر زور سے مجھے ایسا کھینچا کہ بس مجھے گود میں اپنی کر لیا۔ میں تمام بزدلی کو چھوڑ کر موت اور زیست کا معاملہ سمجھکر بجلی کی طرح جھٹکر اس زور سے تڑپی کہ نیچے گری اور اُدھر اس نے مجھے ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ اُٹھا کر بیچ پر اِس زور سے پٹخا کہ بیان سے باہر میرے مُنہ سے چیخ یہ چیخ نکل رہی تھی اور اس نے مجھے بیقابو کر ہی لیا تھا کہ زور سے کسی نے ڈبہ کے دروازہ کو ایک نعرہ کے ساتھ دھکا دیا۔ "بدمعاش!" کہکر گرج کر دروازہ سے بجلی کی طرح ایک نوجوان اس تیزی سے نکلا کہ حب تک گارڈ سنبھلے سنبھلے اور ہوشیار ہو اور اس ملائے ناگہانی کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہو اُس نے لپک کر گارڈ کی گردن پر اس زور کا مکا رسید کیا ہے کہ اس نے ایک دم سے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا۔ اور دونوں ایک زبردست اور خونی جنگ میں مشغول ہو گئے۔

گارڈ بھی مضبوط آدمی تھا اور مجھے چھوڑ کر وہ اپنے حملہ آور پر ڈپٹ کر بڑھا اور اس زور سے اُس نوجوان کے کندھے پر پوری طاقت سے گھونسا دیا ہے کہ یاد ہی تو کرتے ہوں گے۔ اب دونوں میں گُتھم گُتھا گھونسا اور ہاتھا پائی ہونے لگی۔ دونوں طاقتور اور مضبوط آدمی تھے، نوجوان میں اگر پھرتی زیادہ تھی تو گارڈ میں طاقت اور بوجھ زیادہ تھا۔ گارڈ کا گھونسا نہایت اطمینان سے مگر زور کے ساتھ پڑتا تھا۔ مگر نوجوان کی تیزی اور پھرتی قابل داد تھی۔ مار پیٹ میں اس کی کوشش تھی کہ وہ گارڈ سے گتھ جائے اور لپٹ پڑے۔ مگر گارڈ چونکہ جسیم اور بھاری بھر کم آدمی تھا اس لئے لپٹ پڑنا ممکن نہ تھا۔ اسی جیقلش کے دوران میں گارڈ نے ایک دم سے لپک کر ایک بڑا سا چاقو اُٹھا لیا۔ جو سامنے کی بیچ پر رکھا تھا۔ اور اس زور سے بھرپور ایک ہاتھ نوجوان کے عین سینہ پر مارا

کہ میں دیکھ نہ سکی اور میری آنکھیں از خود بند جیسے ہوگئیں اور چیخ پڑی۔ نوجوان نے مجبوراً چاقو کا وار اپنے بائیں ہاتھ پر لیا اور گارڈ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ میں نے دیکھا کہ چاقو نوجوان کی ہتھیلی پر پڑا مگر اتنے میں اسکو موقعہ مل گیا اور قبل اس کے کہ گارڈ اپنے حملہ کی جھوک سے سنبھلے نوجوان نے غوطہ کہا کر اور چاقو کی سیدھ سے صاف نکل کر بائیں کنپٹی پر گارڈ کی اس زور سے گھونسا دیا ہی کہ وہی سری کا تہا جو جھیل گیا۔ اور پھر قبل اس کے کہ وہ اس سخت حملہ سے سبھلے نوجوان نے کمر میں ہاتھ ڈالکر کس پھرتی سے اسکی ٹانگ سے ٹانگ لڑائی ہے کہ بوری کی طرح وہ گرا اور گردن دباکر اسکا سر بنچ کے پایہ میں دیدیا۔ مگر گارڈ کے ہاتھ میں چاقو تہا اور اس نے اندھادھند چاقو کے ہاتھ چلانا شروع کئے۔ مگر نوجوان اب پشت پر تہا اور اس نے ہاتھ بچا کر گارڈ کی کلائی پکڑی اور گردن کو گارڈ کی زور سے جوتہ سے دباکر ہاتھ مروڑ کر چاقو چھین کر کہڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور پھر گارڈ کی گردن اچھی طرح دباکر جو اس نے گھونسے لگانا شروع کئے ہیں تو مارتے مارتے مارتے مارتے گارڈ کا منہ توڑ دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہورہا تہا کہ نوجوان شاید پاگل ہوگیا ہے کس غیض وغضب سے اس نے بُری طرح گارڈ کو مارا ہے کہ میں ہل ہل اور دہل دہل گئی۔ اور پھر مارنا بند نہ کیا۔ مگر گارڈ بہی بڑا مضبوط آدمی تہا اور اب اس نے زور لگاکر اٹھنا چاہا تو پھر اس نے غضبناک شیر کی طرح گارڈ کی گردن اپنے جوتہ سے دبائی اور ادہر کو بنچ کے پایہ میں کونے کی طرف گھسیٹر دی اور پھر وہی دیوانوں کی طرح دے گھونسا۔ دے گھونسا۔ اسکو بُری طرح مارنا شروع کیا۔ گارڈ نے پھر کروٹ بدلی اور ایکے زور کرکے سر باہر نکال لیا اور میں سمجھی کہ اب یہ نکل آیا مگر اُسنے گارڈ کو چیت کرکے اسکی گردن اس زور سے اپنے داہنے پیر کے جوتے کی ایڑی سے دباکر مسلی ہے کہ گارڈ کے حلق اور ناک سے ایسی خوفناک آواز نکلی ہے کہ میں سمجھی کہ اب یہ مرا اور نوجوان نے اور بہی زور سے اسکا حلق دبایا میرے اب ہوش جاتے رہے اور اب تک میں بُت کی طرح بیٹھی تہی، ایک دم سے چلا کر اٹھی "خدا کے

واسطے گلا مت گھونٹئے" یہ کہکر میں نے انتہائی پریشانی میں گارڈ کی جان بچانے کے لئے نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ پیر کا دباؤ ذرا ہلکا کیا اور میری طرف دیکھا۔ میں نے بازو چھوڑ دیا اور کہا۔ "خدا کے واسطے .... آپ تو مارے ڈال رہے ہیں۔ مار ہی ڈالیگا"

نوجوان نے کچھ نہ کہا مگر سر سے پیر تک مجھے ایک نظر بھر کر غور سے دیکھا اور پھر میرے ہولڈال کا تسمہ پکڑ کر کھینچا جو اوپر سے لٹک رہا تھا۔ اس تسمہ سے گارڈ کے دونوں ہاتھ مروڑ کر اور اچھی طرح قابو میں کر کے مشکیں کس دیں اور چھوڑ کر ایک دو ٹھوکریں کس کس کر لگائیں۔ وہ اُٹھا تو اُٹھتے ہی اوسکو سامنے والی بنچ پر زور سے دھکیل کر ایک پوری قوت سے اوسکے چانٹا مارا کہ اس کا مُنہ پھر گیا۔

میرے مُنہ سے پھر نکل گیا۔ "خدا کے واسطے میرے اوپر رحم کیجئے... ان کو مت ماریئے.. میرا دل پریشان ہوا جاتا ہے"

اس کے جواب میں پھر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "یہ اسی لایق ہے" مجھ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف پہونچی۔ اگلے اسٹیشن پر اسے پولیس کے حوالہ کرتا ہوں"

(۳)

میری طبیعت کو اب قدرے سکون تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ اب میری جان اور عزت محفوظ ہے۔ مگر میری طبیعت کی کمزوری تو دیکھو۔ جب مجھے ایسا ڈر نہ رہا تو اب گارڈ پر بجائے غصہ یا ڈر کے مجھے ایک طرح کا رحم آرہا تھا۔ اُسکو دیکھ دیکھ کر بیحد شرم سی آرہی تھی کہ اپنی بیوقوفی سے کمبخت میرے بہانہ سے اتنی بُری طرح مارا گیا۔ چنانچہ جب انہوں نے کہا کہ اسکو آگے چلکر حوالہ پولیس کردوں گا تو میں نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ اسکی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں کافی سزا مل چکی۔ مجھے بڑا عجیب معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے انہیں اتنا مارا!"

میں کمبل میں اچھی طرح اوڑھے لپیٹے بیٹھی تھی مگر میرا چہرہ حسبِ عادت پورا کا پورا کھلا تھا اور میں بالمشافہ باتیں کر رہی تھی میرے اتنا کہنے پر انہوں نے پھر میری طرف دیکھا۔ اور شاید تعجب سے دیکھا مگر قبل اس کے کہ وہ بولیں گارڈ نے کچھ دبی زبان سے کہا "میں نشہ میں تھا اور اسی سزا کو پہونچا مجھے معاف کیجئے"! اس کے جواب میں انہوں نے پھر غصہ ہو کر گھونسا تانا اور مارنے کو ہوئے کہ میں نے ایک دم سے چلا کر کہا "معاف کر دیجئے"!

وہ رک گئے۔ میری طرف پھر تعجب سے دیکھا "آپ جائیں۔ خطا آپ کی ہے۔ لیکن معاف بھی کر دیا جائے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ انہیں پولیس میں نہ دیا جائے"!

یہ سنکر گارڈ نے میری طرف نہایت ہی عجز سے مخاطب ہو کر کہا: "میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اگر آپ نے معاف نہ کیا تو میری بیوی اور بچے بھوکے مر جائیں گے میں جیل بھیجد یا جاؤں گا اور میری نوکری جاتی رہے گی"!

بیوی بچوں کی پریشانی کا خیال کر کے میں بالکل پگھل گئی اور میں نے کہا "میں ہرگز نہیں چاہتی کہ آپ کی بیوی اور بچے پریشان ہوں"!

یہ کہکر میں نے انکی طرف دیکھا۔ اور اب کی بہت اچھی طرح اور نظر جما کر غور سے سر سے پیر تک دیکھا۔ ایک دم سے میں چونک پڑی۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ انکی بائیں ہتھیلی سے خون بہہ رہا تھا جسکو وہ آڑیں کئے ہوئے تھے۔ میں نے بے ساختہ کہا "ارے! یہ آپ کے ہاتھ سے خون بہہ رہا ہے"!

یہ دیکھکر کہ میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ انہوں نے لاپرواہی سے کہا "یونہی سا کچھ زخم آگیا ہے" یہ کہکر ہاتھ اوپر کو کیا۔ اس میں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

میں تو اس کی عادی ہی ٹھہری۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں نے کمبل علیحدہ کیا

اور کہا " لایئے میں ابھی ڈریس کر دوں "
وہ نہیں نہیں کرتے رہے اور میں نے جلدی سے سوٹ کیس کھولکر اپنا " سفری ڈبہ " نکالا اور اُس میں سے ایک صاف پٹی اور لوشن کی شیشی نکالی ۔ میں یہ مختصر سامان ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں ۔ اس کے بعد میں نے جگ لیکر اُن کا ہاتھ دھونا چاہا ۔ وہ نہیں نہیں کرتے رہے مگر میں نہ مانی اور میں نے ہاتھ دھو کر شیشی سے لوشن لیکر کپڑے کی گدی بنا کر نہایت ہی چابک دستی اور صفائی سے پٹی باندہ دی ۔
اُنہوں نے پٹی کو غور سے دیکھا ۔ پھر مجھے دیکھا ۔ کچھ مسکرا کر بولے " معاف کیجئے گا آپ تو پوری ڈاکٹر ہیں "
میں نے بھی ہنسکر کہا " پوری تو نہیں ہاں آدہی تو ضرور ہوں "
مگر اس دوران میں گارڈ صاحب مسلسل معافی مانگے جا رہے تھے ۔ بے انتہا خوشامد کر رہے تھے ۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا اور قابل رحم پایا نہ تو میں نے کبھی کسی پورے مرد کو اس طرح پٹتے دیکھا تھا اور نہ اس طرح گڑگڑاتے اور عاجزی کرتے دیکھا تھا ۔ شاید میرے دل کی بات اور میری قدرتی کمزوری کا گارڈ کو پتہ چل گیا جو وہ بنچ سے اُتر کر گھٹنوں کے بل میرے سامنے سر جھکا کر معافی مانگنے لگا ۔
میرے لئے یہ ضرورت سے زیادہ تھا میں نے ایک دم سے کچھ بیتاں سی ہو کر چلاّ کر کہا " معاف کیا ۔ معاف کیا ۔ میں نے معاف کیا " اور پھر اپنے محسن سے میں نے سفارش کے طور پر کہا " آپ بھی اس کو معاف کر دیں "
گارڈ پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا اور بڑے عجز سے اُنکی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اُنہوں نے کچھ تامل کے بعد مجھ سے کہا " جب آپ نے خود اُنہیں معاف کر دیا پھر میرے لئے کیا گنجایش رہ گئی

جو میں اس پر سختی کروں ۔ مگر انکو اس طرح چھوڑ دینا اچھا نہیں ہے ۔ یہ پھر اسی قسم کی حرکتیں کرینگے"۔
"ہرگز نہیں ۔ ہرگز نہیں" گارڈ صاحب بولے
میں نے بھی کہا "اب یہ ہرگز ایسا نہ کریں گے ۔ اگر ان میں ذرا بھی انسانیت ہے تو ایسی غلطی اِن سے پھر کبھی سرزد نہ ہوگی میں انکی سفارش کرتی ہوں ۔ آپ بھی اِنکے بیوی بچوں پر رحم کیجئے"
میری سفارش پر اُنہوں نے اُٹھکر گارڈ صاحب کے ہاتھ کھولدیئے ۔ اور گارڈ صاحب نے شکریہ اور سلاموں کا لامتناہی پُل باندھ دیا ۔ اور لُطف تو دیکھو کہ لگے میرا پتہ مانگنے جواب میں اُنہوں نے اس بُری طرح گارڈ صاحب کو گُھورا ہے کہ وہ گھبرا کر چُپ ہو گئے ۔
گاڑی کی رفتار میں کمی ہوئی اُنہوں نے کچھ رُکتے ہوتے کچھ سر جُھکا کر ۔ کچھ ہکلا کر انتہائی تکلف سے مُجھ سے پوچھا "معاف کیجئے گا ۔ . . کیا آپ مُجھکو اپنا یا اپنے والد صاحب کا نام . . یا پتہ بتا سکتی ہیں ۔ آپ شاید طالبعلم معلوم ہوتی ہیں"
"جی ہاں" میں نے کہا "میں آگرہ میڈیکل اسکول میں پڑھتی ہوں اور . . "
چونک کے ایک دم سے وہ بات کاٹ کر بولے "تو کیا آپ کا نام . فی . . فی"
"جی ہاں" میں نے کچھ تعجب سے کہا "جی ہاں میرا نام فیروزہ ہے ۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا"

(۴)

بس بہن اب میں کیا بتاؤں تم سے کہ کیا ہوا ۔ ایک دم سے اُن کے چہرہ پر متانت اور سنجیدگی انتہائی درجہ کی چھا گئی ۔ ایک عجیب خاموشی طاری ہوگئی بُت کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ نیچے فرش کی طرف اُن کی نگاہ تھی ۔ بجائے جواب دینے کے میری طرف نہایت معصومیت سے دیکھا میں کچھ متعجب سی تھی مگر میں نے پھر پوچھا "آپ کو میرا نام کس نے بتایا ؟"
مگر اِس کے جواب میں اُنہوں نے پھر اپنی نظر نیچی کرلی اور دو چار سکنڈ کے مختصر وقفہ کے

بعد پھر میری طرف کچھ معصوم سا چہرہ سا کر دیکھا۔ اب مجھے شبہ ہوا کہ یہ کون ہیں۔ لیکن میں کچھ ڈرسی گئی کہ انہیں کیا ہو گیا اور میں نے انکی حالت کچھ متغیر اور چہرہ بیحد متاثر دیکھکر کہا "ہیں ایہ آپکی حالت ..... آپ میری بات کا جواب بھی نہیں دیتے" میں نے کچھ گھبرا کر یہ کہا کیونکہ اُن کا چہرہ عجیب وحشت زدہ سا ہو رہا تھا۔

اس کا اُنہوں نے جواب دیا لیکن نہایت ہی تلخی سے کہ میں ششدر رہ گئی۔ وہ بولے "کچھ نہیں۔ مجھکو معلوم ... میں نے سُنا ... سُنا تھا۔ آپ کو اس سے کیا بحث ؟"

آخری الفاظ اسقدر اُنہوں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہے کہ ایک لڑکی کے لئے کسی طرح بھی قابل برداشت نہ تھے۔ میں نے اس جھڑکی کو مشکل سے برداشت کیا کیونکہ وہ میرے محسن تھے اور پھر مجھے شبہ ہوا کہ شاید محسن سے بھی زیادہ ہیں اور اسی وجہ سے شاید مجھے اس تلخی سے اذیت بھی زیادہ ہوئی۔ کیونکہ بظاہر کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ چنانچہ مجھے کچھ رونا سا آ گیا۔ اُنہوں نے لاپرواہی سے کھڑکی کی طرف جھانکنا شروع کیا۔

میں نے اپنے کو سنبھال کر کہا "آپ مجھکو اس سے بھی زیادہ سخت جھڑکی دیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی"

خلافِ توقع اُنہوں نے ذرا بھی میرے رنجیدہ الفاظ کی طرف توجہ نہ کی۔ ذرہ بھی متاثر ہوئے بلکہ چہرہ پر شاید اور زکر ختگی آ گئی جیسے کہ وہ مجھے ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ میں اب قطعی سمجھ گئی کہ یہی میرے منگیتر ہیں اور میری اِس آزادی اور بیباکی سے تنہا سفر کرنے کے سخت خلاف ہیں۔ میرا دل جیسے بیٹھ گیا۔ لیکن اب میں نے یہ سوچا کہ میری اُنہوں نے جان اور عزت بچائی ہے لاؤ ان سے تصدیق تو کر ہی لوں اور بن پڑے تو قایل بھی کر دوں۔ چنانچہ دل میں یہ سوچکر میں نے آخری مرتبہ اُن سے پوچھا "اپنا نام دیتے تو کم از کم مجھے تو بتا دیجئے تاکہ میرے والد صاحب آپ کو شکریہ کا خط تو

لکھ سکیں۔ ۔ ۔ ۔ کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ " میں نے اُن کے چہرہ کو غور سے دیکھکر کہا: "کیا آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں ؟"
اس کے جواب میں ایک دم سے اُنھوں نے جیسے چونک کر مجھے گھُور کر دیکھا اُنکا چہرہ اور کرخت ہوگیا اور انھوں نے اور بھی سختی سے حقارت آمیز نظریں میرے اوپر ڈالیں۔ سر سے پیر تک مجھے دیکھا۔ پھر دیکھا کہ اتنے میں گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی اور وہ اوسی طرح مجھے دیکھتے رہے ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رُکی اور جیسے وہ چونک سے پڑے اور ساتھ ہی گاڑی رُکنے کے اُنھوں نے نہایت ہی کرخت اور طنز یہ لہجہ میں جیسے کچھ بگڑ کر مجھ سے کہا: "معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے نفرت کرتا ہوں یا نہیں اسکا تو سوال بیکار ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ میں سخت کمینہ ہوں اور آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔ ۔ ۔ ۔ میرا نام یوسف ہے!"
میرے اوپر ایک بجلی سی جیسے گری اور میرے منہ سے ایک دم سے نکلا "ارے" اور میں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر گویا بنچ پر گر پڑی۔
منہ پر سے جو ہاتھ ہٹا کر دیکھتی ہوں تو نہ وہاں گارڈ ہے اور نہ مسٹر یوسف۔ باہر کھڑکی کے جھانک کر دیکھا تو ایک ویراں سا اسٹیشن تھا اور کسی نے آواز دی "پانی ہندو مانی"۔
میں نے فیروزہ سے کہا کہ میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ تمھارے یہ منگیتر نکلیں گے!

(۵)

فیروزہ نے کہا کہ ابھی پورا قصہ سُنو۔
"ریل چلدی اور میں اپنی گاڑی میں پھر اُسی طرح اکیلی تھی۔ سب سے پہلے تو میں نے جھانک کے دیکھا کہ مسٹر یوسف آئے کدھر سے اور کیسے معلوم ہوا کہ برابر کے کمپارٹمنٹ سے آئے۔ کیونکہ میرا زنانہ ڈبہ ایک بڑے سکنڈ کلاس کا ٹکڑا تھا۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیسے آئے۔ کیونکہ آنیوالا

صرف ایک طرح آسکتا تھا وہ لیسے کہ اپنی کھڑکی سے چلتی گاڑی میں لٹکے اور پھر جھول کر جھٹکا دیکر اپنے مضبوط ہاتھوں کی قوت پر بھروسہ کر کے چھلانگ مار کر میرے ڈبہ کی کھڑکی یا سلاخ پکڑنے کی کوشش کرے اور یہ کام آسان نہ تھا جب جا کر لٹک کے پائیدان تک پہونچے۔ یہ خیال کر کے کس طرح جان جوکھوں میں ڈالکر آئے ہونگے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ دیکھ کر میں اب اپنی جگہ آکر بیٹھی گذشتہ واقعات میری آنکھوں میں ایک دم سے پھر گئے۔ میں کچھ عجیب ہی شکست خوردہ ہو رہی تھی۔ مجھے سخت اور منہ توڑ جواب ملا تھا میں نے انہیں اور انکے خاندان بھر کو کمینہ کہا تھا ذلیل کہا تھا بزدل کہا تھا۔ اب میں نے دل میں سوچا تو معلوم ہوا کہ بھلا ایسا شخص کس طرح بزدل اور کمینہ ہو سکتا ہے جس نے ایک بیکس اور کمزور لڑکی کو بچانے کی خاطر اپنی جان خطرہ میں ڈالدی۔ کس طرح عین موقعہ پر پہونچے ہیں۔ جیسے کوئی نیکی کا فرشتہ نازل ہوتا ہے۔ اور پھر کس طرح شیر کی طرح ایک قوی ہیکل سے خونی جنگ کی کس گھما گھمی اور جوانمردی سے اُس سے لڑے اور کس بہادری سے دشمن کو زیر کیا اور کس سبک دستی سے اوسکا چاقو چھین کر اوسکو مارا نہیں بلکہ باہر پھینکدیا۔ کس طرح بھرپور گارڈ کے سینہ پر تان کر ہاتھ مارا تھا۔ اگر صحیح بیٹھ جاتا تو کیا ہوتا؟ قطعی جان کی خیر نہ تھی۔ بھلا ایسا جری اور شیر صفت انسان کس طرح بزدل اور کمینہ ہو سکتا ہے۔

میں نے غور کیا کہ میں نے اُنکو کمینہ کیوں کہا۔ تو معلوم ہوا کہ محض اسوجہ سے کہ اُنھوں نے اور اُنکی بہن نے انتہا سے زیادہ کوشش کی ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ دُنیا بھر کی سفارشیں بہم پہونچائیں ہر قسم کے رسوخ اور اثر کو کام میں لائے بس . یہی کمینہ پن تھا اور یہی ذلیل حرکت تھی ورنہ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں۔

چنانچہ جب میں نے اِن تمام امور پر غور کیا ٹھنڈے دل سے غور کیا تو میرے ضمیر نے

میرے اُوپر سخت ملامت کی۔ میں نے بہت زیادتی کی۔ میں نے سخت ناانصافی کی جو ایسے
شخص کو کمینہ اور ذلیل کہا۔

مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ بیحد مجھے رنج ہوا۔ بیحد میرا دل کڑھا۔ بیحد میری روح کو تکلیف ہوئی میں
سخت ہزیمت خوردہ اور انتہائی روحی تکلیف میں مُبتلا تھی کہ ایک دم سے میری نظر پلنگ کے پاس
ایک سُرخ و سیاہ دھبہ پر پڑی! میں ذرا آگے کو جھکی کیونکہ مجھے ذرا بھی خیال نہ رہا تھا۔ روپیہ بھر
برابر جگہ میں خون جما ہوا تھا اور قریب ہی اسکے ایک دوسرا خون کا دھبہ تھا مگر یہ مٹا ہوا اور گھسا ہوا
تھا۔ جیسے کسی چیز سے رگڑ گیا ہو۔ معاً میرے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال کوند گیا "یہ ایک شریف اور
بہادر انسان کا خون ہے . . یہ وہ خون ہے جو میری جان اور عزت بچانے کی خاطر بہا
ہے"! معاً مجھے کچھ شُبہ ہوا اور میں نے اپنے داہنے پیر کے جُوتہ کو دیکھا . خدا کی پناہ! میں نے
اس خون کو اپنے جُوتہ سے رگڑا تھا! ایک دم سے میری حالت بگڑ سی گئی۔ اسقدر زبردست ضرب
میرے دل پر پڑی کہ سرد سی ہو گئی۔ یہ گُناہ!! . . ایک دم سے میں نے عالم بے اختیاری میں ایسا
رومال نکال کر اس پاک خون کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر پوچھ لیا۔ جُوتہ کو اتار کر اچھی طرح رومال سے پوچھا۔
رومال کو آنکھوں سے لگایا۔ مُجھے سخت صدمۂ جانکاہ پہونچا۔ ایسا کہ اس سے پیشتر مُجھے کبھی ایسا
صدمہ نہیں ہوا تھا۔ میرا دل کٹا جاتا تھا اور میری حالت غیر ہو گئی . میں رو رہی تھی
میری ہچکی سدھ گئی اور اس قدر میں پُھوٹ کر روئی ہوں۔ اسقدر روئیں ہوں کہ خدا کی پناہ۔

میں نے اسی رومال سے اپنی پُرنم آنکھیں پوچھیں سفید ریشمی رومال تھا اور سارا خون میں
رنگین ہو گیا۔

میں تھک کر اور پست ہو کر تکیہ لگا کر لیٹ گئی۔ کمبل کو میں نے اچھی طرح اوڑھ لیا۔ رومال
میرے سینہ پر خون میں رنگا ہوا رکھا تھا اور میں گویا صدمہ سے نڈھال ہو کر اس رومال کو غور سے

دیکھ رہی تھی۔
دیکھتے دیکھتے میں کچھ سوتے اور کچھ جاگتے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی اسٹیشن آیا اور واقعی اسٹیشن آیا تھا۔ اسٹیشن کی آوازیں مجھے ایسی معلوم ہو رہی تھیں کہ جیسے کوئی دُور سے بول رہا ہے۔ اور مجھے یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ گاڑی کب چلی۔
ایک دم سے ایک کھٹکا سا ہوا اور آنکھ کھلتے ہی میں نے دیکھا کہ کوئی سیاہ کپڑے پہنے ہوئے میرے ڈبہ میں گھس آیا۔ مارے دہشت کے میرے منہ سے ایک زور سے چیخ نکلی اور میں بیہوش ہو گئی۔
مجھے ہوش آتا معلوم ہوا بہت زور لگا کر میں نے آنکھیں کھولیں جو پھر بند ہو گئیں پھر زور لگا کر میں نے آنکھیں کھولیں کچھ دھندلا سا سایہ سا معلوم دیا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر کے جو کھولیں ہیں تو میں نے مسٹر یوسف کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ ایک ہاتھ میں اُن کے میرے بائیں ہاتھ کی نبض تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ میرے اوپر کمبل ڈھک رہے تھے۔ میں نے ایک نظر تو جا کر انکی طرف دیکھا اور پھر فوراً اُٹھنے کی کوشش کی وہ اشارہ سے منع کر کے سامنے والی بیچ پر بیٹھ گئے۔ میرے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے اور حلق میں کانٹا سا پڑا تھا۔ میں نے جگ کیطرف دیکھا تو فوراً انہوں نے گلاس بھر کے پانی مجھے دیدیا میں اُٹھنے لگی تو سہارا دیکر مجھے اُٹھانا چاہا مگر میں خود اُٹھ بیٹھی اور پانی لیکر پیا تو میری حالت ٹھیک ہو گئی۔
میں نے جس طرح ممکن ہو سکا شکریہ ادا کیا اور کہا: "میں کس زبان سے آپکا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے دوبارہ میری جان بچائی۔"
ہنسکر انہوں نے کہا: "لاحول ولاقوۃ۔ میں ہر اسٹیشن پر آپ کے ڈبہ کی نگرانی کرتا ہوں۔ اتفاق تو دیکھئے کہ جیسے ہی گاڑی چلی ہے میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش آپ کے ڈبہ میں گھسا۔ فوراً میں

کود کر چڑھ آیا۔ مگر وہ کُود کر دوسری طرف نکل بھی چکا تھا سامنے ہی سے اُسے ایک اور آدمی کے پاس کھڑا دیکھا ریلوے کا کوئی قلی تھا۔ اُس پار جانا چاہتا تھا۔ مگر آپ کا خوف کر رہا تھا۔ میں خود ڈر گیا ۔"

اتنا کہکر اُنھوں نے خون میں لتھڑے ہوئے رومال پر جو میرے سینہ پر کمبل کے اوپر رکھا ہوا تھا غور سے دیکھا۔ بلکہ نظریں وہیں گاڑ دیں اور وہ بھی اسقدر غور کے ساتھ کہ مجبوراً مجھے بھی رومال کو دیکھنا پڑا۔

بس ایک دم سے میرا چہرہ فق سا ہو گیا۔ سعاً اُنھوں نے سوال کیا۔ سخت متعجب ہو کر "یہ رومال! کیا . . . "

میں شرم سے پانی پانی ہو گئی اور قُدرتی طور پر میری نظر رومال سے ہٹکر اونکے روشن چہرہ پر پڑی پھر اوسی جگہ پر جہاں سے میں نے خون پونچھا تھا۔ ساتھ ہی اونکی نظر بھی میری نظر کے ساتھ ساتھ گئی اور اُنھوں نے خون کے پونچھنے کا نشان صاف دیکھا۔ پھر رومال کو دیکھا اور پھر اُس دھبہ کو۔ ایک دم سے اونکا چہرہ جیسے تمتما اُٹھا اور اُنھوں نے میری کمزوری کو اور پریشانی کو دیکھ کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ لیکن فوراً ہی وہ مضمون کیا کہ مرے پر سو دُرّے۔ کہنے لگے "آپ نے اپنا رومال ناحق خراب کیا کسی کاغذ سے پونچھکر پھینک دیا ہوتا کہ کہیں آپکے جُوتہ میں نہ لگ جاتا۔"

یہ چوٹ مجھ سے نہ سہی گئی اور ایک دم سے میں نے کمبل میں مُنہ چُھپا لیا۔ میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں ڈُبڈبا آئیں۔ میں بالکل بے قابو پھر ہو گئی ابھی ابھی بیہوش ہو چکی تھی۔ برداشت مشکل ہو گئی۔ میں کمبل میں مُنہ بند کئے اپنا بُخار نکالا کی۔ اسٹیشن بہت جلد آ گیا اور قبل اسکے کہ ریل رُکے میں نے کمبل جو مُنہ پر سے ہٹایا تو وہاں کوئی نہ تھا۔

دوسرے روز بمبئی پہونچ گئی مگر نہ تو اُنھیں کہیں راستہ میں دیکھا اور نہ بمبئی میں۔ بمبئی میں دو روز رہنا دوبھر ہو گیا اور وہاں سے جس طرح ہو سکا جلدی کر کے بھاگی۔ واپسی میں مارے ڈر کے

تیسرے درجہ کا ٹکٹ لیا۔

اب تم ان تمام معاملات پر غور کرو اور صلاح دو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے ؟"

میں نے سارا قصہ بڑے اطمیناں سے سنا اور کہا کہ بہن تمہیں اب یہ کرنا چاہئے کہ جس طرح بن پڑے یوسف صاحب کو راضی کرو۔ میری دانست میں اُن سے زیادہ حقدار تمہارا کوئی نہیں اور میں اس معاملہ میں گلے گلے تمہاری مدد کروں گی۔"

(۲)

میں نے سارا قصہ مولانا کو سنایا۔ اُنہوں نے خوش ہوکر کہا کہ "یہ کون بڑی بات ہے۔ کل ہی لو۔ یوسف صاحب ایسے کم ظرف نہیں جو ایک لڑکی کے خلاف اس طرح دل میں عناد رکھیں گے۔"

میں نے کہا "تم عناد لئے پھر رہے ہو۔ دونوں کی شادی گھٹواؤ" اِسکا بھی جواب اُنہوں نے یہی دیا کہ یہ کون بڑی بات ہے۔

اب لُطف سُنئے کہ رات ہی کو وہ یوسف صاحب کے پاس بورڈنگ میں گئے۔ اُنہوں نے اس غیر معمولی توجہ کی وجہ پوچھی یا پھر دوسری طرح کُرید کر معلوم کر لیا کہ فیروزہ آئی ہے۔ لہٰذا ایک سرے سے آنے ہی سے انکار کر دیا اور عُذر یہ کہ "میں کیا کروں گا" بہت کچھ مولانے زور دیا۔ سمجھایا تو اُنہوں نے کہا کہ میں کسی شریف زادی نوجوان لڑکی سے اِس طرح ملنا جُلنا بہت معیوب سمجھتا ہوں۔ جب اُنہوں نے کہا کہ وہ کچھ معذرت کرے گی اور شکریہ ادا کرے گی تو اُنہوں نے کہا کہ "بخدا تب تو اور بھی مجھے نہ جانا چاہئے کیونکہ میں نے جو کچھ کیا وہ ہر غیور اور نوجوان کا فرض تھا اور رہ گئی معذرت تو اس کی تو ذرہ بھی ضرورت نہیں۔ گذشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط۔"

جب وہ اِس طرح بھی قابو میں نہ آئے تو مولانا نے کہا کہ بھئی "اب صاف صاف سُن لو۔ ہماری یہ

رائے ہے کہ اس خدمت کے صلہ میں ہم تمہاری اُن کی شادی ٹھیک کرادیں"
اس مذاق پر فلسفیانہ انداز سے وہ بگڑ بیٹھے "یہ خوش" انہوں نے کچھ بُرا مان کر کہا "لاحول ولاقوۃ۔ اس کا توکبھی خیال بھی دل میں نہ لانا۔ عمر میں شاید میں نے ایک ہی کام کیا ہے جس پر میرا ضمیر مجھے شاباش دیتا ہے کہ میں نے بے غرض اور بے لوث ہو کر اپنی جان خطرہ میں ڈال کر ایک بیکس کی موقعہ پر امداد کی اور تم یہ چاہتے ہو کہ میری عمر کا واحد کارنامہ غرض مندی اور صلہ کے لالچ سے آلودہ ہو کر مٹی ہو جائے۔ اس کا تو مجھے خیال بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ تم اس کا خیال کرنا"
قصّہ مختصر مولانا نے سخت مُنہ کی کھائی اور کچھ خفیف ہو کر واپس ہوئے دوسرے دن پھر گئے تو پھر انہیں اٹل اور ضرورت سے زیادہ اپنے ارادہ پر قائم اور حد درجہ کا متین پایا۔ لاکھ لاکھ سر مارا مگر مدۂ خداش سے مس نہ ہوا۔ جھک مار کے اور ہار کے بی فیروزہ چلی گئیں کیونکہ زیادہ وہ ٹھہر نہ سکتی تھیں۔
یہ ہوا اُس نفرت کا انجام جو بی فیروزہ کے سینہ میں یوسف صاحب کی طرف سے جاگزیں تھی کہ بی فیروزہ پریشان اور شکست خوردہ تھیں۔ اُن کی زندگی بقول خود اُن کے ایک ذلیل زندگی تھی۔ قصّہ مختصر کہ ان کا مقصدِ حیات اب اُن کے سامنے تھا سب سے پہلے تو اُس نسبت کو توڑنا تھا جس کے چھوٹ جانے کا اندیشہ کسی وقت میں وبالِ جاں تھا اور جو خود اب وبالِ جان معلوم ہو رہی تھی اور سمجھ میں نہ آتا کہ کس طرح گلوخلاصی ممکن ہو گی۔
دراصل ہماری معاشرت بھی بعض اوقات عجیب عجیب پیچیدہ مسئلے پیش کرتی ہے اور بالخصوص لڑکی خود کی حالت ایسے موقعہ پر قابلِ رحم ہوتی ہے اگر وہ ذرا بھی اپنے نسوانی وقار اپنے جذبۂ خودپسندی۔ اور اپنے صحیح اور بالغ جذبات کا اظہار کرتی ہے اور اس پر کاربند ہوتی ہے یا ہونا چاہتی ہے تو اسکے تمام افعال صحیحہ کو جو دراصل فرشتہ خصالی پر مبنی ہوتے ہیں ایک دنیا کی دنیا

کیا عزیز واقارب اور کیا دیکھنے سُننے والے۔غرض سب کے سب بازاری عشق اور بدچلنی پر محمول کرتے ہیں۔سب یہی کہتے ہیں کہ آزادی تو دیکھو آوارگی تو دیکھو۔بدچلنی تو ملاحظہ ہو۔یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ غریب لڑکی عشق ومحبت کا نام تک نہیں جانتی۔فرماں بردار بیوی بنکر ایک اچھے شوہر کے ساتھ رہنا اسکا مقصد حیات ہوتا ہے اور تمام افعال اسکے بازاری عشق یا بدچلنی اور گندگی سے پاک ہوتے ہیں اور کچھ اور ہی جذبات ہوتے جو لڑکی کو کسی خاص وجہ سے کسی کا گرویدہ کر دیتے ہیں۔مگر ہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ "صدا نیخ انگشت بجاں نہ کرو" گوسفند کے لباس میں بھیڑیئے بھی ہیں۔مگر تُف ہے اوں لوگوں پر جنکو حدیثیں بھی تلاش کرنا آتی ہیں تو ایسی کہ آوارگی اور بدچلنی عورت کا خمیر ہے۔

ذرا غور کیجئے فیروزہ کی حالت پر کیا یہ تقاضائے نسائیت نہیں کہ وہ یوسف کی عمر بھر زرخرید لونڈی بنکر رہنے کی تمنا پر مرمٹے۔

باب (۱۴)

شاہدہ کی شادی

(۱)

شاہدہ ایک پھول تھی جو کُمہلا کر رہ گیا شادی کے غم میں سوکھ کر وہ کانٹا ہو گئی۔ اُسکا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ روتے روتے اسکو غش آجاتے تھے اور نہ معلوم کون چیز تھی جو اُسکو خودکشی سے باز رکھے ہوئے تھی میں بہت کچھ سمجھاتی مگر اس کا غم بے پایاں تھا پیشتر جب کبھی وہ ملتی تھی ہنستی اور ہنساتی تھی اور اب وہ ملتی تو روتی اور رلاتی تھی، اور وہ بھی ایسی کہ ہچکیاں بندھ جائیں۔

اُسکا رنگ و روپ سب رخصت ہو چکا تھا۔ اُس کے شاداب چہرہ پر مُردنی چھائی رہتی تھی۔ افسوس کہ وہ شباب اور جوانی کی بہترین اور چُلبلی تصویر اب رنج و غم سے گُھل گُھل کر ماتم اور افسوس کا اُجڑا سا خاکہ ہو کر رہ گئی تھی۔

ابوالحسن صاحب جب کبھی مولانا سے شاہدہ کی حالت سُنتے تو مُسکرا کر کہتے "سب ٹھیک ہو جائیں گی۔ کشمیر لے جاؤں گا" وغیرہ وغیرہ۔ پھر بھی مولانا نے کوششوں میں کمی نہ کی خود میں نے کیسے کیسے ابوالحسن صاحب کو خط لکھے۔ مگر بیکار۔ شاہدہ کی والدہ صاحبہ سے کس کس طرح ہم لوگوں نے کہا مگر وہ بھی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ اُلٹا یہی کہتیں "بیٹی کیا اس خاندان کی عزت گنواؤں گی۔ بڑھاپے میں مُنہ کالا کرواؤ گی۔ سمجھاؤ کمبخت کو۔"

ہم سب دیکھتے تھے کہ ابوالحسن صاحب کے روپیہ کا زور کیسا ہے۔ جو دیکھتا اور سنتا شاہدہ کے حق میں دعا کرتا۔

شاہدہ کی اب یہ حالت تھی کہ ہمجولیاں اس سے باتیں کرتیں اور درد بھری باتیں سنکر منہ موڑکر ٹھنڈا سانس لیکر آنکھیں ایسی پوچھ کر رہ جائیں۔ کسقدر اچھی گانے والی تھی۔ ایک روز اُسی کا دل بہلانے کو ہم دو چار لڑکیوں نے گانا شروع کیا۔ پھر شاہدہ کو بھی گانے پر مجبور کیا اس نے اوّل تو انکار کیا مگر پھر اصرار سے مجبور ہو گئی، اس نے گانا شروع کیا۔ اس کی سُریلی آواز میں اب عجیب درد و گداز تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ باجہ سے سور نکل رہا ہے۔ گاتے گاتے اُس کی آواز بدل گئی۔ گھُٹ کر بند ہو گئی، وہ خود رو رہی تھی اور ہم سب بھی اُسکے ساتھ اُس کے درد بھرے گیت نے اپنے سوز و گداز سے اوروں کا دل پگھلا دیا۔ چشم زدن میں گانے کی محفل رونے کی مجلس ہو گئی۔

(۲)

شادی کے ہفتہ میں وہ سب سے ملکر رخصت ہوئی۔ خود روتی اور ملنے والیوں کو رُلاتی۔ سب دعا کرتے کہ اللہ تیری مشکل آسان کرے۔ صبر کر۔ مگر وہ تو ارادہ ہی دوسرا کر چکی تھی۔

میرے ہاں وہ آئی۔ اُسکی طبیعت میں عزم و سکون معلوم دے رہا تھا بڑے استقلال سے اُسنے مجھ سے کہا "میں سُن سی ہو گئی پیروں تلے سے میرے زمین نکل گئی" وہ خودکشی کرنے پر تیار تھی! لاکھ میں نے سمجھایا بجھایا مگر اوسکو اپنے ارادہ میں مستقل پایا۔ غرض مجھ سے آخری ملاقات کر کے وہ روتی دھوتی چلی گئی۔ کیا واقعی خودکشی کریگی؟ میں نے مولانا سے پوچھا انھوں نے کہا "کیا عجب ہو زندگی سے بے زار ہے۔"

رات بھر میں بے چین رہی۔ صبح اُٹھتے ہی دوڑی گئی دیکھوں تو شاہدہ جیتی جاگتی بیٹھی ہے مجھے دیکھکر بے موقعہ مسکرا دی۔ مجھ سے تو وہ ایسی خوفناک باتیں رات کو کر کے آئی تھی کہ میں یہ سمجھی تھی کہ صبح شاہدہ کی موت کی خبر آئے گی میں نے کہا "کمبخت تو اور مصیبت میں مصیبت کئے

ٹے رہی ہے"

اسپر وہ مسکرا کر کہنے لگی: "پہلے میں نے رسی کا پھندا حلق میں ڈالکر کسا تو بہن جب گلا گھٹتا تو پھڑک کر میں نے دور پھینکا۔ پھر رات کو ماچس اور چھوڑیاں سل پہ جاکر پیسیں کہ انہیں گھولکر پی لوں۔ مگر خیال آیا کہ آنتیں کٹ جائیں گی سخت درد ہو کر مرونگی۔ پیٹ کے درد سے میں ویسے ہی ڈرتی ہوں، پھر اس کے بعد کوٹھے پر چپ کے سے چڑھی کہ اپنے کو گرادوں۔ نیچے اندھیرے میں جھانک کے جو دیکھا تو مارے ڈر کے دم نکل گیا۔ بھاگی سیدھی وہاں سے۔ چاقو چھری سے گلا کاٹنا میرے بس کی بات نہیں اور زہر ملتا نہیں۔ میں تو گھل گھل کر اب مرونگی"

میں وہاں سے طے کر کے چلی آئی کہ شادی سے پانچ روز پہلے آجاؤنگی۔

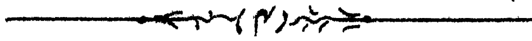
دوسرے روز گھر پر زینت کا خط ملا۔ وہ ایسی بے خبری میں لکھنؤ میں دن گذار رہی تھی کہ یہاں کی اسکو خبر ہی نہ تھی۔ بستم یہ کیا کہ اپنا پتہ ہی نہ لکھا جو خط لکھکر کچھ نجمی کا حال احوال پوچھتی۔

(۳)

میں اپنے کپڑے ستے اور سوٹ کیس درست کر رہی تھی کیونکہ شام کو شاہدہ کے یہاں جانا تھا اور کم از کم پانچ چھ روز کے لئے۔ میں کپڑے درست کر رہی تھی کہ بی جم والی آئیں۔ ویسے ہی کچھ دن سے یہ الگ تھلگ نہیں اپنے قصوں کی وجہ سے ان کے قصے ہی تھے کہ طرح طرح کی باتیں اور شگوفے ہر اتوار کو جم کے خط کے ساتھ چھوٹتے تھے ہر ہفتہ کچھ نئے خیالات۔ کچھ نئے تفکرات، اُن کی زندگی ہی ایک دل خوش کن خواب تھی۔ ویسے تو ہم سب میں آپس میں بڑی گہری دوستی تھی مگر پھر بھی شاہدہ کو مجھ سے زیادہ لگاؤ تھا اور جم والی کو زینت سے زیادہ لگاؤ تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ باتیں گھر کی قربت سے شاید متعلق نہیں۔ قصہ مختصر جم والی حیران اور پریشان پہونچیں۔

"خیر تو ہے؟" میں نے حواس باختہ دیکھکر پوچھا۔
گھبرا کر جم والی بولیں کہ "وہ آگیا!...... نجمی"
"ہیں"! میں نے تعجب سے کہا "نجمی!"
"ہاں" جم والی بولیں "اور میرے یہاں ٹھہرا ہے! بھائی جان کے یہاں! پھر بھائی جان نے خود مجھے بلا کر اُس سے ملایا یہ کہکر "یہ نجمی جم کے بڑے دوست ہیں۔ ملو ان سے"
میں سخت تعجب میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ میں بھلا کیا کرتی محو گڑا ایسے ملی جیسے کبھی پیشتر کی ملاقات ہی نہ تھی"
"پھر کیا کروگی تم؟" میں نے جم والی سے پوچھا۔
"کروں گی کیا؟ میں ڈر رہی ہوں"
"تم کہدو نا اپنے بھائی جان سے اور نہیں تو لاؤ میں کہلوا دوں"
"ناہیں" جم والی ڈر کے بولی "مار ڈالے گا مجھے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ میں نے شاہدہ کے یہاں جانے کی کوشش کی تو بھائی جان نے کہا کہ" ابھی سے جا کر کیا کروگی گھر میں مہمان آیا ہے۔ اب میں گھبرا رہی ہوں کہ کیا کروں"
میں نے یہی رائے دی کہ اپنے بھائی صاحب سے صاف صاف کہدو ورنہ خیر نہیں۔ چنانچہ جم والی وعدہ کر کے گئیں کہ ضرور کہدوں گی۔ جم والی کہنے لگیں کہ بھائی جان تو اُس سے ایسے بے تکلفی سے ملے جیسے اُنہیں پیشتر سے جانتے ہیں لیکن جب میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ جم کے دوست ہونے کی وجہ سے بے تکلفی ہے ورنہ پہلے کبھی نہیں ملے۔ جم کا وہ موذی کوئی خط لایا ہے۔ میں اِس وجہ سے اب اور بھی ڈر رہی ہوں کہ اُنہوں نے کہدیا ہے کہ شام کو اُن کے ساتھ موٹر پر گھومنے جایا کروں۔ میں تو ہرگز نہ جاؤں گی"

غرض اسی قسم کی اندیشہ ناک باتیں کرکے حرم والی چلی گئیں۔ میں عجیب سوچ میں تھی اور حرم والی کی طرف سے سخت متفکر تھی کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ایک طرف شاہدہ کی طرف سے فکر کیا کم تھی کہ یہ دوسرا وہم سوار ہو گیا۔



شاہدہ کی شادی میرے لئے بدترین مصیبت تھی۔ اُس نے تین روز پہلے کھانا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں اس لئے آئی تھی کہ اُسے دلاسا دوں گی مگر میرا تو اُس سے بھی زیادہ ابتر حال ہو گیا۔ مگر ذرا غور تو کیجئے کہ آنے والیاں کیا کہتی تھیں ایک بولیں "ہمارا اپنا حال ماں باپ کے غم میں اس سے بھی بدتر ہو گیا تھا" دوسری بولیں "ہم نے خود دس روز کھانا نہیں کھایا تھا" تیسری بولیں "ہم اس سے بھی دُبلے ہو گئے تھے" چوتھی بولیں "ہم خود مہینہ بھر دن رات روئے تھے" غرض وہاں کوئی ایسی بی بی نہ تھیں جن کو شاہدہ کے حالات قابلِ رحم یا غیر معمولی معلوم ہوتے۔



عین رخصت والے دن مولانا کا ایک رقعہ آیا کہ مجھ سے دس منٹ کے لئے مل لو۔ جوں توں کرکے میں اُن سے ملی تو اُنہوں نے وہ خبر وحشت اثر سنائی کہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ خبر کیا تھی کہ میرے لئے پیغام موت تھا۔ مختصراً کہتی ہوں کہ حمی حرم والی کو موٹر میں لیکر شام کو ہوا کھانے گئے۔ آبادی سے دور مغرب کے وقت سنسان سڑک پر انہوں نے ایک دوسرا موٹر کھڑا دیکھا۔ حمی نے ڈرائیور سے کہا موٹر روکو۔ ڈرائیور نے موٹر کے پاس موٹر روک لیا۔ دوسرے موٹر کا ڈرائیور منہ پر ڈھاٹا باندھے تھا کہ پہچانا نہ جاسکے۔ حمی نے اپنا پستول نکالکر ہاتھ پکڑ کر حرم والی کو دوسرے موٹر میں ڈالا اور حرم والی کے گولی مارنے کی دھمکی دے کر حکم دیا کہ میرے ساتھ بیٹھو کوئی آٹھ میل اپنے ساتھ لیجا کر چھوڑ دیا کہ بھاگ جاؤ۔ رات کے دس بجے بیچارہ ڈرائیور گھر پہنچا اور

نئی روشنی کے دلدادہ بھائی سے بہن کی فراری کا قصہ تفصیل کے ساتھ سنایا۔ بھائی نے ڈانٹ کر کہا "بھاگ جاؤ مت بکو فضول۔ خبردار کسی سے تذکرہ اسکا کیا"! اللہ اللہ خیر صلاح !!

میں اس خبر کو سنکر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مولانا نے کہا اِسکا بڑا چرچا ہو رہا ہے بلکہ سب کو یہ شبہ ہو رہا ہے کہ خود بھائی نے بیاہی لڑکی کو دوسرے کے حوالہ کر دیا۔ بالفرض یہ بھی کیا تب بھی جو ستم غریب جم والی پہ ہوا اُسکا کسی کو کیا علم ہو سکتا ہے۔ میں نے رنجیدہ ہو کر دل میں کہا دونوں بیچاریوں کی شاہدہ اور جم والی دونوں کی تقدیر پھوٹ گئی۔ شاہدہ تو پھر بھی شاید بچ جائے مگر جم والی کے بارہ میں مجھے قطعی یقین ہو گیا کہ سر پٹک پٹک کے جان دیدے گی

اب میں اپنی سوسائٹی کی موجودہ خطرناک آزادی پر غور کر رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ "کیا اسی پر دعوے ہے انکو اپنی تعلیم اور شائستگی کا۔ کیا اس آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی نئی روشنی کے یہی خطرناک نتائج ہیں۔ کیا اسی شرافت پر یہ دعویداراں تہذیبِ جدید اپنی معاشرت کی بنیاد رکھیں گے آئیں خطا کس کی تھی؟ نہ جم والی کی اور نہ اُنکے بھائی کی اور نہ ظالم بجی کی بلکہ اس کورانہ تقلید کی جس کی رو اندھادھند ہماری سوسائٹی کو بہائے لیجا رہی ہے"!!

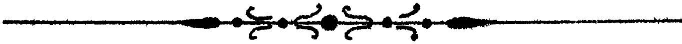
(۵)

شاہدہ کی شادی اور جم والی کا غم۔ خدا کی پناہ۔ مجھے اپنی شادی سے پہلے کی تمام مصیبتیں یاد آگئیں۔ مگر ان میں اور اُن میں بڑا فرق تھا اُس کا انجام نیک ہوا اور اسکا انجام؟ یہ سوال تھا۔

رخصت کے وقت جو کہرام ہوتا ہے ظاہر ہی ہے اور پھر میں نے اس میں کیا کچھ نہ اضافہ کیا ہوگا جبکہ میں خود شاہدہ سے گلے ملکر بیہوش ہو گئی۔ غرض شاہدہ اِدھر رخصت ہوئی اور اُدھر میں بیمار پڑ کر گھر پر آئی۔

میاں ابوالحسن نے انمول بیوی کو لیکر سیدھے کشمیر کا رخ کیا۔ اسی روز اسی گاڑی سے وہ سیدھے کشمیر چلدیے۔

ہفتہ بھر تک میری حالت ابتر رہی۔ جب ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی تو دل ٹھیک نہ طبیعت ٹھکانے۔ اپنی عزیز تریں سہیلیوں کا باغ اس طرح اُجڑ گیا۔ میں رہ رہ کر روتی اور شاہدہ اور حمو والی کے حسین اور معصوم چہرے میری آنکھوں کے سامنے آکر مجھے تڑپا جاتے۔ میں بہت دن اپنے کمرہ میں منہ دیئے اپنی سہیلیوں کی یاد میں تڑپا کی۔





بی شاہدہ اور جم والی کے وُجود کا گویا میرے لئے خاتمہ ہی ہو چکا تھا۔ جم والی کا تو پتہ ہی نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا اُنکو آسمان۔ رینت تو لکھنو کی رینت ہو کر رہ گئیں اور درصل اُنکا قیام یہاں پر تھا بھی عارضی اور اب تو شاید واپسی کی امید بھی نہیں تھی۔

شاہدہ کو شادی سے رُخصت کرا کے مسٹر ابوالحسن کشمیر لے گئے۔ اور وہاں جاکر وہ رویہ اختیار کیا کہ دل میں میرے ناسور ڈالدیئے۔ میں نے دو خط شاہدہ کو لکھے مگر جواب ندارد۔ ایک اور لکھا تو شاہدہ کا مختصر سا جواب آیا۔ وہ یہ کہ "خط ملا مفصل پھر لکھوں گی" اُس کے بعد پھر خاموشی میں نے پھر لکھا تو پھر یہی جواب آیا کہ "خط ملا ہے اور مفصّل جواب پھر دونگی"

صاف ظاہر تھا کہ مسٹر ابوالحسن نے وہ مضمون کر رکھا تھا کہ ع نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے شاہدہ کو وہ دل کا حال کیوں لکھنے دیں گے! میں نے دل میں کہا۔ میں نے غلطی کی جو اس سے تفصیل پوچھی کہ تمہارے اُوپر کیا گذرتی ہے اور کیسا برتاؤ ہے۔

مارکے چین لیگا میں نے دل میں کہا۔ کس موذی سے کمبخت کا پالا لوگوں نے ڈالا ہے۔

غرض تھوڑے دن تک تو کڑھا کی اور رنج کیا کی جب شاہدہ کی مصیبت کا خیال آجاتا دل

مسوس کر رہ جاتی۔ آنکھیں نم ہو جاتیں۔ دل سے ایک پُر درد آہ نکلتی کہ خدا کی شان ہے۔ دیکھو عبرت کا مُقام ہے کہ وہ جو ہر وقت پھول کی طرح کھلی رہتی تھی جس کی رگ و پے میں شرارت اور تیزی زندہ دلی اور خوش دلی بھری ہوئی تھی اسکو گردش نے یوں پیس کر مٹی کر دیا کہ اب تک تو وہ خاموش ہے۔ کوئی مجھے جیسے چھیڑ کر کہتا تھا۔

اے بزم تیرا عشوۂ دلجو کدھر گیا سر چڑھ کے بولتا تھا وہ جادو کدھر گیا!

کلیاں وہ کیا ہوئیں تیرے دامانِ ناز کی تو بھینی بھینی آتی تھی زُلفِ دراز کی!

میں کیا کہوں کہ وہ سر پہ چڑھ کے بولنے والا جادو کدھر گیا! آنکھیں اسکی غمناک تھیں اور دِل پُر تاب۔ اب تو سرم ہی ویران تھی۔ تمام دامانِ ناز کی کلیاں خزاں کے ہاتھوں بن کھلے مرجھا گئیں تھیں۔

"اینتو یاد ایام عشرت فانی" کہکر میں فیروزہ کی اُلجھنوں میں پڑی ہوتی تھی۔ ایسا صدی فلسفی بھی دیکھنے میں کاہیکو آیا ہو گا جیسے مسٹر یوسف۔

"آپ کون ہیں؟" اُنھوں نے ایک روز مولانا سے پوچھا "کیا آپ پیغام بر ہیں؟ یا پیر شناسِ حقیقت یا محض خدائی وجدار! اور پھر کچھ مطلب بھی تو آخر واضح ہو کہ جناب کس حیثیت سے اور کیا فرماتے ہیں؟"

مولانا بولے کہ "بھائی میں یہ کہتا ہوں کہ اس غریب نے جو کچھ کیا حماقت اور جہالت میں کیا اور اسکو سخت شرمندگی اور افسوس ہے"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"اپنی بیوی کے دریعہ سے"

"اچھا تو پھر؟"

"پھر یہ کہ آپ نے سخت ترین طنزیہ جملے استعمال کئے اور اس غریب کی شکست اور اعترافِ غلطی کو بھی تسلیم نہیں کیا۔"

"یہ غلط ہے۔" وہ بولے۔"مجھے تسلیم ہے میں نے طنزیہ جملوں سے کام لیا۔ مگر وہ امر قدرتی تھا۔ آپکو معلوم ہے کہ میرے لئے کیا کیا شائستہ الفاظ انہوں نے استعمال کئے تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آسماں کا تھو کا حلق میں آیا۔ لیکن مجھے جب بھی افسوس تھا اور اب بھی ہے میں انکے اعتراف کی قدر کرتا ہوں۔ انکی شرافت کی داد دیتا ہوں اب اور کیا سر دے ماروں۔"

مولانا نے انکی طرف دیکھا۔ کیا تجاہلِ عارفانہ سے وہ کام لے رہے تھے اور پھر بایں ہمہ مولانا نے کہا۔"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا یہ خیال ہے" وہ بولے۔"کہ وہ ایک اچھی صورت شکل کی ملکہ نہایت ہی خوبصورت لڑکی ہے نہایت ہی شریف اور ایک بھولا اور معصوم مگر جلد نازک دل اپنے پہلو میں رکھنے والی۔"

"تو پھر آپ اُس سے شادی کریں گے؟"

"آپ کی کیا رائے ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔

"میری یہ رائے ہے کہ آپ اُنکے یہاں پیغام بھیجیں۔"

"پیغام بھیجوں؟ . . . . اور وہ پھر میری اسی طرح مٹی پلید کریں۔ میں نے عمر میں ایک اور صرف ایک کارنامہ کیا ہے بغیر کسی دنیاوی لالچ کے اور وہ یوں برباد ہو۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کس طرح میں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا تھا۔"

مولانا بولے "مجھے سب معلوم ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ پیغام تو بھیجیں۔"

"مگراس کا ثبوت؟"

"میں یقین دلاتا ہوں۔"

"معاف کیجئے۔ ۔ ۔ بالفرض میں یقین نہ کروں تو کیا مضائقہ ہے؟"

"پھر جس طرح آپ کہیں آپ کا اطمینان کرایا جاسکتا ہے۔"

"مگر میں شادی نہ کرنا چاہتا ہوں تب؟"

"شادی تو آپ کی ہوگی اور بالضرور ہوگی اور آپ کریں گے لہذا کیوں نہ یہاں ہو۔ میری درخواست پر۔"

"آپ کی درخواست؟ یا اور کسی کی؟ دیکھئے یہی باتیں آپ کو غیر معتبر ساتی ہیں کس کی درخواست ہے کہ میں اُن سے شادی کروں؟"

"میری! میری!! میری!!!" مولانا زور دیکر بولے "میری بیوی کی درخواست پر!"

"معاف کیجئے گا، اور گستاخی معاف، آپ کی اور آپکی بیگم صاحبہ دونوں کی درخواست قطعی نامنظور" اب معلوم ہوا کہ آپ پیغامبر نہیں بلکہ خدائی فوجدار ہیں حضرت آپ کون؟"

مولانا ہنسکر بولے "میں پیغامبر ہوں۔ بخدا خدائی فوجدار نہیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "اور میں ختم نبوت کے بعد پیغامبر پر تو تڑی چیر ڈاکیہ کے وجود سے ہی منکر ہونے کی فکر میں ہوں کیا وہ خود لکھنا نہیں جانتیں؟ اگر انہیں کچھ مجھ سے کہنا سننا یا پیغام بھیجنا ہے تو بسم اللہ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ مجھے انہیں کوئی پیغام نہیں دینا ہے۔ نہ شادی کا نہ ولیمہ کا۔"

مولانا بولے "تو پھر آپ وعدہ کرتے ہیں۔"

"کس بات کا؟"

"کہ آپ شادی کا پیغام دیں گے"

"میں نہیں دونگا۔ نہ میں چاہتا ہوں۔ وہ چاہتی ہوں تو وہ پیغام دیں۔ ابھی ابھی تو سب کچھ سمجھا دیا اور سب کھول گئے! ارے بھائی صاف صاف بات ہے۔ اگر وہ چاہتی ہوں کہ میں اُن سے شادی کروں بلکہ میں نے غلط کہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہتی ہوں کہ مجھ سے شادی کریں۔ تو خود مجھکو شادی کا پیغام دیں۔۔۔۔ اپنے ہاتھ سے!"

"یہ آپ کی زیادتی ہے!" مولانا بولے "آپ ایک مسلمان لڑکی۔ شریف زادی سے کیونکر اسکی توقع کرسکتے ہیں؟"

وہ بولے "میں اسلئے توقع کرسکتا ہوں کہ سب سے پہلی مسلمان عورت نے خود حضورِ انور کو پیغام دیکر شادی کی اور پھر ایک اور صحابیہ نے خود بالمشافہ اور زبانی آپ سے پیغام نکاح دیا کوئی وجہ نہیں جو آج کل کی مسلمان لڑکیاں صحابیات سے بڑھ چڑھ کر اپنا رتبہ بنائیں۔ اگر ضرورت پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ انہیں اگر ضرورت ہو تو ایسا کریں ورنہ جانے دیں جو انکو بے حیا خیال کرے وہ ملعون الدہر ہے اور مسلمان نہیں رہ گیا اسکے پیغام کا قبول کرنا تو وہ میرا فعل ہے۔ میں مختار ہوں اپنے فعل کا، جیسا جی چاہے کرونگا!"

مولانا شکست کھا کر واپس ہوئے۔ چلتے چلتے یوسف صاحب دوڑے اور پکار کر کہا "اجی حضرت! واضح رہے میں تحریر کو اچھی طرح پہچانتا ہوں!"

میں نے یہ باتیں سنکر قطعی طے کرلیا کہ یہ عورتوں کی توہین ہے۔ ہرگز میرا ہرگز ایسا ارادہ نہیں۔ ہرگز ہرگز وہ ایسی ذلت نہیں برداشت کرسکتی۔ انکو مغالطہ ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس سے زاید کچھ نہیں چاہتی کہ اگر ایسا ہوتا تو بہتر تھا۔ اس سے زاید اس کی طرف منسوب کرنا نہ صرف اسکی بلکہ تمام غیور لڑکیوں کی توہین ہے مقصدِ حیات اسکا اگر کچھ ہے یا ہوسکتا ہے تو خودداری وقار

حیا۔ شرم اور ساتھ ہی پھر اظہار تشکر یا مُشابہت کو دیکھتے ہوئے ایک ادنیٰ سا خیال اور یہی باتیں مُبالغہ کی صُورت میں سب کچھ ہو سکتی ہیں مجھے یوسُف صاحب پر سخت غصہ آیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ انکی داستان "خردماغی" فیروزہ کو کُل کی کُل لکھدی جائے۔

مگر مولانا نے مجھ سے کہا کہ "یُوسف صاحب کی تمام حرکتیں "حق بجانب ہیں۔ تمہیں کیا معلُوم کہ اُن کے ساتھ کیا سلُوک کیا گیا ہے۔ جب مُردوں کی توہین ہُوئی تو اب عورتوں کی توہین ہونا چاہیئے۔ کبھی ناؤ گاڑی پر تو کبھی گاڑی ناؤ پر۔ میری تو بڑی طبیعت خُوش ہوئی جو انہوں نے کھری کھری سنائی۔ پچھتّر دفعہ کسی کو غرض پڑی ہو تو پیغام دیتی پھرے نہیں تو وہ اپنے گھر خوش اور یہ اپنے گھر"

اِنصاف کی بات یہ ہے کہ تھوڑی سی میری بھی غلطی تھی جو میں نے فیروزہ کی طرف سے دل میں سوچ کر طے کر لیا تھا کہ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ لیکن واقعہ اگر پُوچھئے تو سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ یُوسف صاحب کی جُرات اور خِدمت سے اسقدر زبردست طریقہ پر مُتاثر ہوتی تھی کہ اپنی گُذشتہ باتیں اوسکو یاد کر کے سخت تکلیف ہونا لازمی تھی پھر معاملہ بھی بیا یا تھا۔

چنانچہ میں نے خوب جلکر اور نمک مرچ لگا کر فیروزہ کو لکھا تو اوس نے وہی جواب دیا جس کی مجھے توقع تھی۔ کچھ تلخی سے اس نے لکھا "خدا نہ کرے میں کسی کی خُوشامد کرتی پھروں یہ واقعہ ہے کہ یُوسف صاحب نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اسکا بدلہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا اور اگر اُن سے شادی ہو جاتی تو عین خوش قسمتی سمجھتی مگر اس کے یہ معنی اُنھوں نے یا تم نے کدھر سے لیلئے کہ میں اُن کے لئے دیوانی ہو رہی ہوں ہاں اگر دیوانی ہو رہی ہوں تو اسقدر کہ بس نہیں میرا کہ کسی طرح اُنکا شکریہ ادا کیا ہو جائے بلکہ اس کا اظہار ہو جائے۔ انکو اختیار ہے کہ جو جی میں آئے مدرامی کر سکتے ہیں پھر بھی میرے اُوپر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

میری حالت زیادہ سے زیادہ اب یہ ہے اور اگر میں شریف ہوں تو ہونا ہی چاہئے۔ اور وہ یہ

کہ مجھے خواہ وہ جو کچھ بھی کہیں حق بجانب ہیں ذلیل کریں تو انہیں حق ہے۔ حقارت کی نظر سے دیکھیں تو درست ہے اور پھر ان سب باتوں کے بعد بھی اگر وہ میرے ساتھ شادی کرنے کا پیغام دیں تو میری ہمت نہیں کہ انکار کرسکوں۔ اس سے زیادہ اگر تم کچھ اور سمجھیں تو تمہاری محبت ہے اور اگر وہ سمجھے تو ان کا حق ہے۔ میں انکے جوتوں کو سر اور آنکھوں پر رکھنا اگر میں شرافت خیال کرتی ہوں تو یہ تو نہیں ہوسکتا کہ نسوانی وقار یا شائستگی کھو بیٹھوں ...۔"

خط پڑھکر میری طبیعت خوش ہو گئی اور مولانا کو بھی معلوم ہو گیا کہ معاملہ کا کیا رنگ ہے۔ وہ کچھ ملول سے ہو گئے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ وہ یہ بھی تو غور کرتے ہونگے کہ میری وجہ سے فیروزہ نے یوسف سے شخص کو ٹھکرایا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ فیروزہ دب جائیگی اور کہتے تھے "کوئی ہرج نہیں ہے اگر وہ خود خط لکھدے"۔ میں کہتی تھی کہ "ہرگز نہیں لکھ سکتی۔ مگر شادی ضرور ہونا چاہئے۔"

بہت جلد دونوں طرف سے ناامیدی ہو گئی۔ نہ یہ دبے اور نہ وہ۔ دیکھا جائے تو دونوں حق بجانب تھے وہ اپنے کارنامہ پر نازاں تھے تو فیروزہ بہ حیثیت ایک نوجوان لڑکی ہونے کے حق دار تھی کہ عرض مدعا نہایت ہی عجز و انکسار سے اونکی خدمت اقدس میں "عرضی سوال" پیش کریں دل کی بات جدا جانے مگر ظاہر میں دونوں اپنے اپنے وقار اور پوزیشن پر قایم تھے صاف معلوم ہو گیا کہ وہ تلون مزاجی اور وہ قلب کی رقت جسکا کہ فیروزہ نے میرے ہاں آکر اظہار کیا تھا محض ایک عارضی اور وقتی چیز تھی مبالغہ جاتا رہا اور اس کی جگہ سلامت اور میانہ روی اور سنجیدگی اور معاملہ فہمی نے لیلی۔

مگر ایک لطف کی بات سنئے کہ بی فیروزہ بڑی تیزی سے اب اس نسبت کو توڑنے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں جس کو پختہ کرنے اور "مستدل بہ نکاح" کرنے وہ مہیؤ دوڑی تھیں! یہ کیوں؟

خدا بہتر جانتا ہے۔
مولانا کہتے تھے کہ "تم دیکھ لینا فیروزہ کو ہار ماننا پڑے گی!"

(۲۱)

اب ایک اور لطیفہ سنیئے۔
ایک روز کا ذکر ہے کہ دروازوں اور شیشوں پر رنگ کرنے کے لئے سفیدہ اور دوسرے رنگ میں نے تیار کئے تھے مولانا مذاق میں کہہ رہے تھے کہ "یہ کیا بات ہے کہ تم میں (کولتار میں) کوئی رنگ نہیں ملایا جاسکتا!"
یہ اون کا دلچسپ ترین فقرہ تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا کہ "تمہارا ڈبہ کہاں گیا؟" مطلب یہ کہ کولتار کا ڈبہ اُسوقت میں بڑی مشغولیت کے ساتھ سفیدی میں سبزہ پھینٹ رہی تھی کہ اتنے میں ڈاکیہ آیا اور ایک "موٹا" سا خط میرے نام کا آیا۔
پتہ دیکھتے ہی فوراً معلوم ہوگیا کہ کس کا ہے۔ بی شاہدہ کا خط تھا۔ "بیچاری شاہدہ!" میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ پُرغم لہجہ میں یہ الفاظ نکلے: "قسمت پھوٹ گئی بیچاری کی!"
یہ کہکر میں نے سنجیدہ چہرہ بنا کر خط کھولا کیونکہ جانتی ہی تھی کہ اس خط میں وہ داستانِ غم ہوگی جو گھنٹوں رُلائے گی۔
اب خط کھولکر جو پڑھنا شروع کیا ہے تو فوراً ہی رُکنا پڑا! "ہیں!" میرے منہ سے نکلا۔ مولانا کی بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "مکارہ کہیں کی!" انہوں نے بھی کہا آپ یقین مانیں کہ خط کا مضمون حسب ذیل تھا۔
میری پیاری بہن۔
تمہارے خط پہ خط پہونچے۔ میں نے اُنکے جواب دیئے مگر سچ پوچھو تو ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔

کیونکہ سوائے اِس کے کچھ نہ لکھا کہ تمہارا خط ملا مفصّل پھر لکھوں گی۔ روز یہی کہتی تھی کہ کل لکھوں گی مگر یہ کل بھی عجیب کل تھی کہ آج آئی۔ اب اسکی وجہ میں کیا بتاؤں۔ دراصل اس سے کہیں پہلے خط لکھ چکی ہوتی مگر لکھا ہی نہ گیا۔ اصل پُوچھو تو معلوم کتنی دفعہ تمہیں خط لکھنے بیٹھی۔ مگر یہی سمجھ میں نہ آیا کہ لکھوں تو کیسے لکھوں۔ ایسی حماقت کا خیال کر کے کچھ لکھا ہی نہ جاتا۔ یہ سوچکر کہ سچ سچ لکھتی ہوں تو معلوم تم میرا کیا فصیحتہ کرو گی اور رسائی (مولانا) کیا کہیں گے بس اسی ڈر کے مارے میں اب تک لکھ ہی نہ سکی پھر اب یہ سوچکر آخر ایک دن لکھنا ہے ہمت کر کے لکھتی ہُوں۔ مگر دیکھو! خفا مت ہونا اور نہ میرا مذاق اُڑانا۔

تُم نے لکھا تھا کہ مُفصل لکھو اور کُل حال لکھو تو میری بہن اب تو کان کھولکر سُن لے اور اچھی طرح سُن لے مگر دیکھ میرا مذاق مت اڑانا۔ تو بہن بات دراصل یہ ہے کہ میں احمق تھی! بلکہ تو بھی اری کمبخت، ابوالحسن صاحب تو بہترین آدمی ہیں! اِن سے بہتر تو جواں دُنیا میں ملنا مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے! اِن سے زیادہ لایق ساتھی تو مجھکو چراغ لیکر ڈھونڈھنے پر بھی نہ ملتا! پھر اِس کے علاوہ اِن سے زیادہ دلچسپ اور اِن سے زیادہ زندہ دل اور اِن سے زیادہ خوش مذاق آدمی میری دانست میں تو دُنیا میں دو تین ہی ہونگے پھر محبت کا یہ حال کہ بہن سچ مانا کہ اِن سے زیادہ بیوی کو چاہنے والا اور محبت کرنے والا شوہر میں نے تو سُنا نہیں۔ بس عاشق زار سمجھو۔ اِن سے زیادہ محبت اور عشق حقیقی رکھنے والا شوہر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوائے میرے کسی دُوسری لڑکی کو بھی ملا ہے (شاہد تمہیں بھی نہیں۔ یا ملا ہے؟)

وہ سچی محبت، جو ایک شوہر کو بیوی سے ہونا چاہئے اُسکی یہ جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اور اب میری بہن، تم یقین کرنا کہ میری عقل نہیں کام کرتی کہ بغیر اِن کے میری زندگی کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ ایک دن تو بہت ہوتا ہے۔ اگر ایک گھنٹہ کے لئے وہ کہیں اور رہتے ہیں تو میرے لئے یہ

جُدائی قیامت ہوجاتی ہے۔ یہ سب کیوں؟ محض اسی وجہ سے کہ وہ محبت جو اُنکو مجھ سے ہے اسکا عشرِ عشیر بھی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

اور اب جو میں گذشتہ واقعات پر غور کرتی ہوں کہ کس طرح میں ہیرے کو ٹھکرا رہی تھی تو یقین مانو کہ کانپ جاتی ہُوں۔ یا اللہ اگر مجھے میرا یہی میاں نہ ملتا تو میں کیا کرتی! میری زندگی کس طرح بے سُود ثابت ہوتی۔ میرا اِس دُنیا میں آنا ہی بیکار ہوتا!

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوگوں نے زبردستی پکڑ کے میری شادی کردی اور خدا کا ہزار در ہزار شکر ہے کہ اُس نے ہماری اور تمہاری سب کی کوششوں کو ناکام کیا۔ اری کمبخت غضب ہی ہوگیا تھا! کہیں جو سچ مُچ میری شادی نہ ہو! میری تقدیر جاگ اُٹھی جو مجھے ایسا محبت کرنے والا۔ عاشق زار۔ عقلمند۔ سمجھدار اور تعلیم یافتہ شوہر خدا نے عنایت کیا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ میرے دِلی جذبات کا اظہار کرکے اُنکی خُوبیاں لکھ سکے۔ قصہ مختصر یہ سمجھ لو کہ ابوالحسن صاحب توبیحد اچھے نکلے۔ مجھ کمبخت کو کیا پتہ تھا! مجھے معلوم ہوتا تو میں کاہیکو زمین آسمان ایک کردیتی۔ غرض مطلب میرا یہ ہے کہ میں اپنے میاں سے اسقدر خوش ہُوں کہ بس نہیں اُسکو دلی کا بادشاہ بنادوں۔ بغیر اپنے میاں کے مجھے دنیا اندھیر ہوجائے۔ تم تو خیر جو کچھ کہو گی وہ میں جانتی ہُوں مگر جانتوں بی کیا کہیں گی۔ میرے ساتھ اُنھوں نے وہ بھلائی کی ہے کہ کبھی نہ بھولُوں گی۔ ہاں بہن ایک اور بات ہے وہ یہ کہ وہاں تُم نے ابوالحسن صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ ابوالحسن صاحب اب نہیں ہیں۔ وہ پُرانی اچکن اور کوٹ نہ معلوم اُن کے کہاں گئے۔ یہاں تو اُنکی شاہ خرچی کا یہ حال ہے کہ میرے اشارہ پر سینکڑوں روپیہ لُٹتے نظر آتے ہیں اور میرے خیال میں کشمیر بھر میں شاید ہی کوئی دُوسرا اُن سے زیادہ خوش وضع اور خوش لباس موجُود ہو۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"

"اری کمبخت، مُردی کہیں کی تیرا بھلا ہو" میں نے کہا "دیکھو تو کمبخت نے میرا حال کس طرح

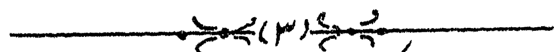
اپنے پیچھے تباہ کیا۔ کیسی کیسی خود ہلکان اور حیران ہوئی۔ زہر پی رہی تھی چھت پر سے کود رہی تھی جان دیئے دیتی تھی اور اب یہ لکھتی ہے! نہ خبر لی ہو اچھی طرح کہ یاد ہی کرے۔"



میں آپ سے صحیح عرض کرتی ہوں کہ اس خط کے بیس دن بعد شاہدہ آئی اور آتے ہی ماری گئی۔ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے اچھی طرح کمبخت کو مارا۔

ابو الحسن صاحب بولے کہ "بہن دیکھ لو تم۔ میں نہ کہتا تھا کہ موٹی ہو جائیں گی۔"

اور واقعی شاہدہ۔ تندرستی اور خوشی اور بشاشتی کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ "کمبخت تو تو کہتی تھی کہ مجھے دق ہو جائے گی تو تو دوگنی موٹی ہو رہی ہے۔" کیونکہ وہی بلکہ اُس سے کہیں زیادہ اس کے خوبصورت چہرہ پر تندرستی اور شرارت کا نور تھا اور وہی قیامت کی آنکھوں میں شوخی اور تن بدن معطر اور معطر ریشم کے بہترین کپڑوں میں وہ آنکھوں کو چیر کر دل میں گھسی جاتی تھی۔ میری خوشی کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ میں نے اوسکو رات کو بھی نہ جانے دیا اور پھر جو باب کھلا ہے باتوں کا تو لوگوں کو دیکھکر ایک الجھن ہو گئی کہ الٰہی یہ انکی باتیں ہیں یا مصیبت! کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی باتوں سے لیکر فیروزہ تک کی تمام باتیں شمار ڈالیں یہاں فیروزہ کی باتوں سے خاص تعلق ہے



شاہدہ نے کہا کہ "بی بان ڈاکٹرنی کو ذرا بلاؤ تو ہم بھی تو دیکھیں کہ وہ کیسی ہیں۔" پھر بولی کہ "وہ اُنکے یوسف کو بھی بلاؤ۔" اور خود اُس نے دم لیا کہ "نہ دونوں کو گانٹھ دیا ہو تو شاہدہ نام نہیں۔"

قصہ مختصر فیروزہ کو میں نے تار دیا خط پہلے ہی لکھ چکی تھی کہ شاہدہ آئیگی تو تمہیں تار دیکر بلاؤں گی۔ وہ چلی آئی اور بی شاہدہ نے تھوڑا سا اُن سے مذاق کرنے کے بعد ہی کہا کہ "لو بہن

تم منگاؤ لڈو ابھی ہم تمہاری شادی رچائے دیتے ہیں مگر خبردار جو تم دبیں اُسے غرض پڑے گی سو دفعہ تمہاری جوتی پر ناک رکھے گا۔ اور ہی سُنو۔ وہ ہیں کون حضرت جو بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ذرا بلواؤ تو اُنہیں "

یہ کہکر مولانا سے کہا گیا کہ کسی طرح یوسف صاحب کو اس طرح بُلا لاؤ کہ انہیں پتہ نہ چلنے پائے کہ کیوں بُلایا ہے بس کسی بہانہ سے اُنہیں لگا لاؤ یہاں پھر میں اُنہیں سمجھ لُونگی۔

اِدھر تو اُوس نے مولانا سے یہ کہا اور اُدھر فیروزہ کو یہ نہ بتایا کہ واقعی اُنہیں اس طرح بُلوانے کا انتظام ہے۔

جب شاہدہ سے میں نے اور مولانا نے یہ پُوچھا کہ اُنہیں بلا کر پھر کرو گی کیا۔ تو اُوس نے کہا کہ "اب سندی وہ شاہدہ نہیں ہے۔ پنجاب اور کشمیر کی ہوا کھلے سندوں کھا کر آئی ہے اور ایسے ویسے چھوکرے تو میرے کوٹ کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ذرا اُنہیں بُلا کر درست کرونگی مجھے ذرا یہ دیکھنا ہے کہ وہ مُجھ سے کیسی منطق بگھارتے ہیں "



دوسرے روز یوسف صاحب کو مولانا بالکل ہی بے خبری میں ایک اور صاحب کی امداد سے لگا لائے اُنکو تو معاملہ سے آگاہ کر کے سرکا دیا اور اُنہوں نے یوسف صاحب سے کہا کہ ابھی آیا، میں یوسف صاحب کے سامنے ہوتی نہیں تھی اور بیٹھنے کا ایک ہی کمرہ تھا۔ فیروزہ کو یہ کہکر کچھ ملنے والے آئے ہیں میں پہلے ہی لے گئی تھی۔ مولانا اور یوسف صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کسی بہانہ سے مولانا "ابھی آتا ہوں" کہکر یوسف صاحب کو کمرہ میں اکیلا چھوڑ کر لپک کر اندر آئے اور مجھ سے کہا کہ اب یوسف صاحب اکیلے بیٹھے ہیں میں نے شاہدہ سے کہا اور شاہدہ اُٹھی مجھے اِشارہ کر کے اور فیروزہ سے کہا "چلو بی ڈاکٹرنی کمرے میں چلیں اب وہاں کوئی نہیں" پُشت کے

کمرے میں آکر شاہدہ نے مذاق میں پیچھے سے میرے دونوں بازو پکڑ کر کندھوں کے پاس زور سے مذاق ہی مذاق میں ریلنا شروع کیا اور سر سے الگ دھکیلا فیروزہ شاہدہ کی اس حرکت پر مسکراتی پیچھے آرہی تھیں میں نے جو شاہدہ کو جھٹکا تو اوسنے "چل ڈاکٹرنی!" کہکر فیروزہ کو ریلنا شروع کیا، فیروزہ کلبلاتی ہنستی تیزی سے چلیں چشم زدن میں برآمدہ طے ہوا اور کمرہ کے دروازہ پر پہونچتے ہی اس زور سے شاہدہ نے فیروزہ کو ریلا دیا ہے کہ دیکھتے بھالتے اونکو یوسف صاحب پر یا اُنکی کرسی پر گرنا پڑا۔ اور قبل اِس کے کہ اس طوفانِ بدتمیزی کے شکار سنبھل سکیں شاہدہ سامنے کا دروازہ بند کرکے باہر سے کُنڈی لگا چکی تھی اور میں اپنی طرف سے بند کر چکی تھی۔

دُوسرے برآمدہ سے ہوکر شاہدہ آنکھیں پھاڑے لپکی ہوئی آئی۔ میں نے کہا کہ "اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوگا؟" شاہدہ نے کہا "ارے ہی ہوگا یہ کہ دونوں کی عقل ٹھکانے آجائے گی اور کیا ہوگا!"

اِتنے میں دروازہ کو اندر سے فیروزہ نے اُنگلی سے بجایا۔ اِسکے جواب میں شاہدہ دانتوں تلے اُنگلی داب کر میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ کہنے لگی "بند رکھو دونوں کو اسی میں شام تک!"

پُورے دو گھنٹہ بعد جو شاہدہ نے دروازہ چپکے سے کھولا ہے تو فیروزہ کرسی پر سے سیدھی اُٹھ کر آئیں۔ نہایت سنجیدہ مگر چہرہ پر ہوائیاں تھیں کہ شاہدہ نے پوچھا۔

"کہو بہن ڈاکٹرنی تمہارے مریض کا کیا حال ہے؟"

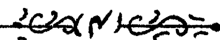
یہ پُوچھا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ فیروزہ کے چہرہ پر آئی اور شاہدہ بولی "دیدیا زہر نگوڑے کو!"

"وہ بالکل چپ سناٹے میں آ رہی گئیں۔ اور دادی اماں سے باتیں کرنے لگیں۔

اب شاہدہ نے اندر جھانک کر نہایت ہی بے تکلفی سے دیکھا یوسف صاحب سے جو اُس کی نظر چار ہوئی تو کھسک کر بولی "کہئیے حضرت علاج کرا چکے"
اُدہر سے جا کر بی شاہدہ نے ہی دروازہ کھولا۔ مولانا گھر میں چھپے بیٹھے تھے کہ یوسف صاحب کا سامنا نہ ہو۔ کمرہ کھلتے ہی یوسف صاحب سیدھے بھاگے۔



اب یہ بات تو بتانے کی نہیں کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں۔ فیروزہ شام ہی کو چلی گئی۔ مگر ہاں نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یوسف صاحب کی کمان ڈھیلی ہو گئی۔ دو دن میں چھ دفعہ دوڑ کر آئے اور کوڑی پھیر الگاتے رہے۔ اور دو تین تار الگ گھر پر دے چکے ہیں۔ قصہ مختصر ہارے اور جھک مارے فیروزہ نے اتنا بتایا کہ "مجھ سے انہوں نے خود اُلٹی معافی چاہی اپنے رویہ کی" یہ کیوں اور کیسے؟ اسکا جتنا فضول پوچھنا ہے اس سے زیادہ فضول بتانا۔ بس اتنا ہی بتا دینا بہت ہے کہ بعد ادب یوسف صاحب کو ایک عرضی پیش کرنا پڑی اور معافی مانگی سو علیحدہ تب جا کر چھ مہینہ کی اُمیدواری اور بیسوں خوشامدیں کرنیکے بعد ڈاکٹرنی ہاتھے چڑھی۔ اس کا ذکر یہاں فضول ہے۔ شاید پھر کبھی۔



فیروزہ کے قصہ کو مشکل سے کوئی پندرہ دن ہوئے ہونگے شام کا وقت تھا اور میں برآمدہ کے سامنے اپنے چبوترہ پر کرسی پر بیٹھی مزے میں دوسری کرسی پر پیر رکھے ہوئے پڑھ رہی تھی کہ کسی نے میری آنکھیں ایک دم سے آکر پیچھے سے بند کر لیں۔
میں سمجھی شاہدہ ہے اور میں نے کہا "چل مسخری" یہ کہکر میں نے ہاتھ جو پکڑے تو کلائی سے کہنی تک ہاتھ دوڑ گیا اور چوڑیاں ندارد۔ شاہدہ کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں! اب حالانکہ

میں اپنی آنکھیں چھڑا سکتی تھی لیکن میں نے خود ہنسکر کہا "ٹھہرو میں بتاتی ہوں "! اوہو! میں نے دل میں کہا کہ آج بی خاتون کی طبیعت میں گدگدی پیدا ہوئی ہے جو اس طرف اتری ہیں اور اندر سے اس طرح آئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اطمینان کر کے کہا "کیوں بی خاتون یہ چوڑیاں آج کیوں اتار دیں"! میرے اس کہنے پر کچھ دبی ہوئی ہنسی سی سنائی دی۔ اور ایک مردانی آواز میں کسی نے کہا "بتا دو تو دس روپیہ انعام"

بوکھلا کر میں نے ہاتھ ہٹانا چاہے کہ یہ کون آگیا مگر وہاں میری آنکھوں کو اور اچھی طرح دبایا اور قبل اس کے کہ میں ہاتھ ہٹا سکوں میرے سر پہ میز پوش ڈال دیا۔

"کون ہے؟" بگڑ کر میں نے جو چھڑا کر کھڑی ہوتے ہوئے میز پوش پھینکا ہے تو میں جیسے سُن سی ہو گئی جم والی کا خوبصورت اور چمکیلا چہرہ ایک طرف گلاب کے پھول کی طرح کھل کر رہ گیا تو دوسری طرف میں صورت شکل ہی سے پہچان گئی نجمی! مگر قبل اسکے کہ میں سنبھل پاؤں جم والی مجھ سے مارے محبت کے لپٹ گئی۔ کس محبت سے اور کس زور سے اُسنے بھینچ ڈالا۔

مجھے چھوڑا تو میرے متحیر اور جھینپے ہوئے چہرہ کو اُس نے غور سے دیکھا میں عجیب چکر میں تھی اور کچھ حمق سی ہو رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ لیکر نجمی سے تعارف کرایا اور کہا "جم"!

منہ سے تو میں نے کچھ نہ کہا لیکن آنکھوں نے میری سب کچھ کہا تو وہ بولے "گھبرائیے مت اچھا نجمی ہی سہی"!

"اوہو! اب میں سمجھی" میں نے کہا "بھائی میٹھو"

دونوں کو اچھی طرح بٹھایا۔ سر سے پیر تک جم والی کو دیکھا اور پھر نجمی یا جم کو دیکھا۔ سب سے پہلے جو میں نے سوال کیا وہ یہ کہ "کچھ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ۔۔۔ " "کہ انہیں اس طرح کیوں پکڑ لے گیا؟ یہی پوچھتی ہیں نا"!

"ہاں" میں نے کہا" یہ عجیب و غریب طریقہ آخر کیوں پسند کیا؟"
"مجھے حیران کرنے کے لئے۔" جم والی بولیں۔
جم نے کہا" پھر آپ ہی بتائیے کہ دوسری صورت کون سی تھی۔ لاکھ ان سے کہا کہ میں ہی جم ہوں مگر یہ نہ مانیں تو کیا کروں۔ اور پھر آپ بیتی تو آپ خود ان سے پوچھئے گا۔ انہوں نے مجھے بہت ہی دق کیا ہے۔"
جم والی نے جم سے کہا کہ اب آپ تو سیدھے گھر جائیے اور میں آؤنگی اب کل صبح۔ کہانا جی چاہے یہاں کہا جائیگا اور جی چاہے وہاں۔"
چنانچہ جم کو رخصت کر کے اب میں اطمینان سے بیٹھی اور میں نے کہا کہ بہن اب تو اپنا قصہ تو ذرا سُنا۔"



جم والی نے تو پورا اپنا قصہ شروع سے آخر تک سُنایا مگر اُس کے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کافی ہے کہ جم والی کے بھائی کی اجازت سے جم نے یہ سب کچھ بھروپ بدلا اور وہ بھلا آدمی سب کچھ دیکھا کیا۔ جم والی نے اس طرح اپنا قصہ سُنایا
"مجھے موٹر میں ڈالکر اور پکڑ کر بمبئی کے بھیس میں سیدھے دہلی بھیجے۔ وہاں ایک بنگلہ پیشتر سے موجود تھا۔ وہاں جا کر مجھے اُتارا۔ کیسے کیسے میں نے ہاتھ جوڑے ہیں خوشامدیں کی ہیں اور کیسا کیسا میں روئی ہوں کہ خدا کی پناہ۔ پھر وہاں دہلی میں پہونچکر مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ کبھی چاقو دکھائے۔ کبھی خنجر دکھائے مگر میں اپنی ضد پر قایم رہی۔ جب مجھے اسقدر اپنے ارادہ پر مستقل پایا تو مجھے ایک کمرہ میں بند کر دیا اور بند کرتے وقت مجھے یہ خط دیدیا۔
"پاگل لڑکی۔ ذرا ٹرنک تو کھولکر دیکھ۔ یہ سب کچھ اور کس کا ہے؟ اچھا سچ بتانا کیسے ملا ہوں؟"

بس اتنی ہی عبارت تھی۔ میں تحریر پہچانتی ہوں اور دھک سے ہو گئی۔ دوڑ کر ٹرنک کھولا تو اوپر ہی پاسپورٹ رکھا تھا اوسکو کھولکر جو دیکھا تو ہاتھوں میں ایک رعشہ سا آگیا۔ بس بہن بیان نہیں کر سکتی کہ میری کیا حالت ہوئی ہے۔ نجمی اور جم ایک ہی ہیں! پاسپورٹ کی پوری تفصیل دیکھی اور سولہ آنہ تصدیق ہو گئی۔ پاسپورٹ کے پاس ایک اور خط ملا جس میں اس عجیب و غریب طریقہ پر ملنے کے وجوہات درج تھے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ تمہارے بھائی سے پوچھ لیا تھا۔ پھر اپنا اور زینت کا ڈور کا رشتہ تھا اوسکی تفصیل بتائی کہ کس طرح زینت کو رازدار بنایا تھا۔ میرے گذشتہ خطوں کے حوالے دیئے تھے۔

میں عجیب ہی خیالات میں غرق تھی کہ کمرہ کھلا تو مارے شرم کے میں جھک سی گئی چپ کی چپ رہ گئی۔

بیٹھکر مجھے تفصیل کے ساتھ سمجھایا کہ کس طرح مجھے بیوقوف بنایا۔ میری سمجھ میں بھی آگیا جب انہوں نے کہا کہ تصویر بھی تو اسی وجہ سے میں نہیں بھیجتا تھا اس کے بعد پھر مجھے اپنا سرٹیفکٹ دکھایا جو ولایت سے حاصل کیا تھا کچھ تمغے دکھائے۔ غرض سیکڑوں ثبوت دے ڈالے۔

اس کے ہفتہ بھر بعد کا حال سنو۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اب تم میری بیوی تو ہو ہی گئی ہو لاؤ اب تم کو اصل بات نہ بتا دیں۔

میں نے کہا "وہ کیا؟"

بولے "ہم اصل میں جم دم کچھ نہیں ہم تو واقعی نجمی ہیں"

میں نے ہنسکر کہا "ہوا کرو۔ مجھے معلوم ہے"

کہنے لگے "اری لڑکی میں نے بڑی مشکل سے جم کو پچاس ہزار روپیہ دیکر تجھے لیا ہے۔ تجھے تو میں پارسال ہی دیکھ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جم نے تیرے تمام خطوط وغیرہ دیئے ہیں"

میں مسکرا رہی تھی۔ پھر بولے "دیکھو اب جو ہونا تھا سو چکا جم نے تمہیں چھوڑ ہی دیا میں تمہیں سب حال بتاتا ہوں"

یہ کہکر اُٹھے اور ایک پاسپورٹ دوسرا میرے سامنے ڈالدیا۔ بالکل ویسا ہی، یہ جمی کے نام سے تھا اور تصویر بھی انہی کی۔ صرف نام میں فرق تھا۔

اب ذرا میں چکرائی تو بولے "معاف کرو اب تو جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔ اب مجھ سے نکاح اور کر لو"

میں نے غور سے چہرہ پر دیکھا اور مذاق کو سمجھ کر میں مسکرا کر بولی "جانیئے بھی۔ اور خط و تحریر؟ "مجھے دراصل خیال ہی نہ تھا کہ میرے سامنے بیٹھکر کبھی نہیں لکھا ہے۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہو" وہ بولے "یہ دیکھو میری تحریر۔ میں لکھتا ہوں" یہ کہکر لکھا اور کہا "اب تمہیں کچھ یاد پڑا کہ زینت کے یہاں اُس روز جو میں نے لکھا وہ یہ خط ہے یا جم کا خط ہے"

"اور وہ تحریر جو اُس روز ٹرنک میں ملی تھی وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جم سے لکھوالایا تھا۔ پچاس ہزار روپیہ کاہے کو دیئے ہیں۔ اور پھر تمہیں اپنے بھائی کو خط نہیں لکھنے دیتا ہوں یہ دیکھو سب کے سب جو تمنے گزشتہ ہفتہ میں لکھے وہ یہ رہے۔ میں نے ایک بھی نہیں ڈالنے دیا" یہ کہکر خطوط سب کے سب میرے سامنے ڈالدیئے "پھر تمہاری سمجھ میں یہ بھی نہ آیا کہ آخر میں تو تمہیں پکڑ کر لایا ہوں۔ جم کو بھلا اس کی کیا ضرورت تھی"

یہ کہکر اس طرح سنجیدہ صورت بنائی کہ خدا کی پناہ۔ میں سہم اور لرز گئی اور میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ "خدا کے واسطے مجھے پریشان مت کرو۔ کیوں مذاق کرتے ہو" میرا یہ کہنا تھا کہ اور ثبوت دینے لگے۔ خط کھولکر دکھائے جنہیں انگلستان کی مُہریں تھیں وہیں کے تھے۔ پتہ پر جمی لکھا ہوا تھا اور جم کے ہاتھ کے خطوط تھے۔ میں نے پہلا خط ہی جو دیکھا ہے اور پڑھا ہے اسکو جم نے لکھا تھا میرے

مارے میں پچاس ہزار روپیوں کا ذکر اور شرط یہ کہ کُل خطوط دیدوں گا اور جو خطوط لکھواؤ گے سب لکھ دوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا کیا حال ہوا۔ چکر سا مجھے آتا معلوم ہوا۔ کمرہ گھومتا دکھائی دیا اور پھر میں وہیں بیہوش ہو کر رہ گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ جھکے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں میرے چہرہ پر بل پڑ گئے اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ہنسکر بڑی محبت سے بولے "جم کی دیوانی میں جم ہوں۔ ذرا اُٹھ میں ابھی تجھے سب بتاتا ہوں" میں ایک دم سے خوش سی ہو گئی "اللہ کرے یہ قطعی جم ہوں" میں نے دل میں کہا اور انہوں نے سہارا دیکر مجھے اُٹھایا۔

اب انہوں نے بھائی جان کے خط دکھانا شروع کئے جو انہوں نے اس تجویز کے بارہ میں لکھے تھے۔ انہوں نے صلاح دی تھی کہ تمہاری یہ تجویز کہ تم اپنی بیوی سے اس طرح بھیس بدلکر ملو تمہاری رائے میں درست ہو تو میری دانست میں ٹھیک نہیں اور آئندہ تمہیں اختیار ہے۔ پھر ایک دوسرا خط اور دکھایا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا اور آخر میں صاف صاف لکھا تھا کہ بیوی تمہاری ہے تمہیں ہر طرح کا اختیار ہے" اب میں پھر اسی طرح باغ باغ ہو گئی۔ بے ہوشی کا صدمہ مجھے معلوم ہی نہ دیا گھنٹہ بھر بعد ہی چاق و چوبند ہو گئی۔ شام کو بولے کہ "ہم نے دیکھا کہ تو مری جا رہی ہے لہذا مجبوراً تجھے اُلٹے سیدھے خط دکھا کر راضی کر لیا ورنہ ہم تو شرطیہ نجمی ہیں۔ اری بیوقوف تو نے یہ نہ دیکھا کہ وہ خط تو جم کو لکھے گئے تھے۔ یہ تجویز بیشک جم کی تھی لیکن اُسے روپیہ دیکر ہمیں یہ سب خرید لئے اور اب ہم کر گذرے" اب میں پھر چکرائی تو اور دو ایک ثبوت دیئے، اور میں حیران ہوئی تو پھر مجھ سے کہا کہ بڑی احمق ہے" ارے میں ہی تو جم ہوں" میں نے کہا کہ اچھا ان باتوں کی تردید کر دو تو کہا صبح کر دیں گے

بہن میں کیا بتاؤں کہ مجھے کیسا دق کیا ہے صبح ثابت کر دیتے کہ جم ہوں اور شام کو

پھر بھی تمام باتیں خطوں کے ذریعہ سے اور تحریر کے ذریعہ سے۔ آخر کار پھر میں نے تحریر بھی لکھوائی تو حم کی سی تھی جب تحریریں سے دیکھ لی تب مانی۔ لیکن پھر دوسرے دن طرح طرح سے یہ ثابت کر دیا کہ میرا انکا خط ایک سا ہے۔ میں نے مشق کی ہے اور غور سے اگر دیکھو تو فرق معلوم ہو جائے۔ دن بھر مجھے طرزِ تحریر کو شناخت کرنے کے طریقے بتائے اور پھر ایک روز یہی ثابت ہو گیا کہ حم نہیں بھی ہیں۔

غرض کہاں تک کہوں میں نے آخر کو تنگ آکر اسپر غور کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جب ایک دفعہ ثابت ہو گیا کہ حم ہی ہیں تو پھر اس کے بعد میں نے کہدیا کہ اس کی میں تردید ہی نہیں سنوں گی لیکن خدا کی پناہ! آج سے پندرہ سولہ روز پہلے کا ذکر ہے جب ہم شملہ میں تھے۔ وہاں جب انھوں نے دیکھا کہ اب میں اس کی تردید ہی نہیں سنوں گی کہ حم نہیں ہیں تو عجیب ترکیب چلی۔ دو تین روز ڈاک اس طرح لیتے کہ مجھے نہ ہوتا کہ کوئی خط مجھ سے چھپا کر رکھ لیا۔ میں نے پوچھا تو ٹال دیا۔ میں بھی بھول گئی۔ دو ایک دفعہ اسی طرح کیا اور ٹال دیا۔ مجھے روپیہ کی ضرورت تھی میں نے جو کہا کہ روپیہ چاہئے تو کہا کہ "میرے بھورے کوٹ کی جیب سے لے لینا"۔

میں نے جو بھورے کوٹ کی جیبیں دیکھیں تو وہاں ایک نوٹ بھی نہیں۔ ہاں ایک خط نکلا جس پر سُرخی سے لکھا تھا "خفیہ"! میں نے جو اسے پڑھا تو میرے ہوش جاتے رہے۔ کسی دوست نے اُنکے دلی سے لکھا تھا۔ اُس میں یہ لکھا تھا کہ "تم جم کا پارٹ خوب کھیل رہے تو اب ذرا ہوشیار رہو۔ جم بمبئی آگئے ہیں اور وہیں سے اُنھوں نے پولیس میں رپورٹ کرا دی ہے اور رسید ہے دہلی آرہے ہیں۔ تاریں تمکو دے چکا ہوں۔ دہلی سے انہیں پتہ چل جائیگا کہ شملہ میں ہو لہذا بہتر ہے کہ فوراً تم نینی تال چلے جاؤ یا اور کہیں چھپ جاؤ اور اس سے پیشتر جو تمہیں دو خط لکھے ہیں تو انہیں بھی احتیاط سے پھاڑ کر پھینک دینا۔ اب تمہیں

بیحد ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔" وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسی قسم کی باتیں لکھی تھیں۔

اب مجھے پھر کریدسی ہوئی اور میں نے تمام ٹرنک اور کپڑے تلاش کرنا شروع کئے تو وہ تار بھی مل گیا اور دونوں خطوط بھی مل گئے۔ ان میں بھی یہی سب باتیں لکھی ہوئی تھیں اور ایک میں وہ فقرہ لکھا تھا کہ میں سناٹے میں آ گئی۔ لکھا تھا کہ تم جو کہتے ہو کہ لڑکی بہت بھولی اور سیدھی ہے تو کیا اتنی احمق ہے کہ وہ سمجھی ہی نہ ہوگی کہ آخر اب تک بھائی سے خط و کتابت نا ممکن ہے اس میں کوئی راز نہیں ہے۔ ایسی تو احمق کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ غرض اسی قسم کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اب میں سخت چکرائی۔

اُدھر باہر سے جو آئے تو قبل اس کے کہ میں کچھ زبان سے نکالوں مجھ سے عجیب ہی گھبراہٹ میں کہا کہ "چلو مینی تال چلیں۔"

اب میں سناٹے میں آ گئی۔ پھر کیا بتاؤں کہ کس کس طرح تنگ کیا ہے۔ اقبال کر لیا کہ میں بجی ہوں اور بہت سے ثبوت دیئے میرا کیا کیا بُرا حال ہوا ہے۔ مجھ سے کہا کہ اب پھر کیا چاہتی ہو۔ میں نے جواب دیا کہ سوائے موت کے کچھ نہیں چاہتی ہوں مگر بھائی سے ذرا مجھے ملوا دو کہ مرنے سے پہلے انہیں اچھی طرح بتا دوں کہ جان بوجھ کر مجھے کہاں جھونکا۔ اب یہاں جو آج آئی ہوں تو بھائی جان نے گلے لگا کر کہا کہ پاگل ہوئی ہو اور رحم سے کہا کہ "اب جو تم نے اسے تنگ کیا تو ہم تمہیں ماریں گے بہت۔" انھوں سے کہہ دیا ہے کہ اب سچ مچ اگر یہ بجی ہیں تب ہی تو نہ مانا۔ غرض آج میں نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔"

حم والی نے اپنے عجیب غریب شوہر کا قصہ ختم کیا ہے اور اس قصہ پر میں اپنے دلچسپ قصہ کو ختم کرتی ہوں۔ والسلام

"کولتار"

نوٹ

اس کتاب کو پڑھ کر اور بالخصوص اِس آخری باب کو پڑھ کر اگر کسی صاحب کو اسبات پر مصنف پر غصہ آئے کہ اُسنے "بالشویزم" کی تبلیغ کی ہے اور وہ اس کتاب یا اس کے باب کو معاشرتی۔ اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں تو اگر وہ صاحب غیر مُسلم ہیں تو کچھ نہیں ورنہ اگر مسلمان ہیں تو اسکے جواب میں مُصنف اُن سے ڈانٹ کر کہتا کہ "خاموش! مقامِ ادب ہے۔ زبان تھام کر! کہیں جہنّم میں نہ جا پڑو! بہتر ہے کہ پہلے مُصنف کی کتاب قرآن اور پردہ کا باب "کورٹ شپ اور اسلام" پڑھ لو کہ وہ کتاب مُصنف نے اپنی تمام کتابوں کے لکھنے سے پہلے ہی لکھ کر رکھدی ہے۔

مرزاجی

ملک کے مشہور ادیب حضرت ایم اسلم نے اس کتاب میں ایک دُنیا سے نرالے کردار کی تخلیق کی ہے۔ مرزاجی کے واقعات پڑھکر اسقدر ہنسی آتی ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی لوٹ لوٹ جائیں۔ مرزاجی سے متعلق مضامین کے علاوہ بے شمار اور مزاحیہ مضامین اس کتاب میں شامل ہیں اس شان کی کتاب اب تک آپکی نظر سے نہیں گذری ہوگی۔ ضخامت تقریباً (۳۵۰) صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتا ساقی بُک ڈپو۔ دھلی

مزاحیہ کتب کا بیش بہا ذخیرہ

کتب مصنفہ مرزا عظیم بیگ چغتائی

روح ظرافت آٹھ مزاحیہ افسانوں کا دلکش مجموعہ "انگوٹھی مصیبت" "کولتار" "الشذری" "شاطر کی بیوی" وغیرہ۔ مع مقدمہ از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی قیمت عہ

روح لطافت "روح ظرافت" کا دوسرا حصہ۔ اسمیں بھی "مہارانی کا خواب" "ٹیلیفون" "ممتحن کا پان" اور "کہربا بہادر" جیسے آٹھ نادر افسانے ہیں قیمت عہ

چینی کی انگوٹھی اور لوٹیکا راز۔ یہ کتاب پلاٹ کے لحاظ سے بھی ایسی ہی عجیب غریب ہے جیسا کہ اس کا نام۔ ایک لوٹے نے دو انسانوں کی زندگی میں کس طرح انقلاب پیدا کر دیا؟ قیمت ۸/

تفویض ایک حیرت انگیز طویل خواب جسمیں مصنف عورت بن جاتا ہے۔ اس حالت میں کیا کیا واقعات پیش آئے دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت (۵/)

قرآن اور پردہ۔ آیات قرآنی سے پردہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ اسلامی پردہ کیا ہے اور رسمی پردہ مسلمان عورتوں کے لئے کیا عذاب بن گیا۔ مصنف نے نہایت تحقیق و کاوش سے یہ کتاب لکھی ہے قیمت عہ

خانم۔ اس کتاب میں گھریلو زندگی کا اسقدر دلچسپ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ آج تک کسی اور کتاب میں آپنے نہیں دیکھا ہوگا دیورانی جٹھانی کی نوک جھونک باہمی شکر رنجیاں پُرلطف مزاحیہ پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

ساقی بک ڈپو دہلی